Al-Hikmat

Volume 35 (2015) pp.1-36

مسئلہ تقدیر

ڈاکٹر عبدالحفیظ فاضلی

سابق چیئرمین، شعبہ فلسفہ جامعہ پنجاب، لاہور، پاکستان۔

Abstract

Breifly stated the problem of destiny (*taqdeer*) amounts to the following:

"Each individual is predestined for heaven or hell since the time of the creation of mankind; actions to be performed by each and every individual for which he will be held answerable on the Day of Judgement are pre-written since the timeof the creation of the Preserved Tablet."

Or

"No indiviual is predestined for hell. Actions performed by an individual are not pre-written on the Preserved Tablet; they are written when they are performed. Man is free in his intention (*niyat*), is free in taking the line of action (*rukh*) for using *taufiq*. *Taufiq means ability to do* granted to anybody by Allah. Man is answerable to the extent he is given *taufiq*. Consequences are subservient to the Will of Allah and belief in this is part of Faith."

First of the above views is presented by Muhammad Fethullah Gulen, a contemporary Turkish scholar. Most of the traditional scholars hold the same view. The second view is constructed by us on the basis of the Quran. Intention is best known to Allah Almighty and Allah

Almighty highly appreciates good intentions. However, Quran as *al-haqq* holds the status of authority. If any thesis is incongruent with the Quranic teachings, it is unlikely that it would spread light. Vagueness in the concepts of Allah's Omniscience, human freedom, Divine Pleasure (*raza*), Divine Will (*mashiyat*), *time*, Preserved Tablet, and status of the Quran as *al-haqq* and the status of the compilations of the traditions (*ahadith*) has been found to be a common characteristic in writings on *Taqdir*. The purpose of present work is to construct the above concepts on the authority of the Quran. If anywhere the writer has differed with anybody's ideas, what is considered right by him is presented in its place on the authority of the Quran for وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ط(wa *mun Asdaqu min Allahi Haditha) "Whose statement is more true than Allah's Hadith!"(04:87)*

Key Words: Destiny, Predestination, Omniscience, Free Will, Omnipotence, Divine Pleasure, Divine Will, Eternity, Everlastingness, Timelessness

فرمانِ الٰہی کے مطابق قرآن پاک قول ہے اور 'الحق' ہے۔قرآنِ پاک کے حوالے سے بات کرنا سند(authority) کے ساتھ بات کرنا ہے۔سند کے بغیر بات کرنا دراصل قیاس آرائی ہے،تخمین وظن ہے۔تخمین وظن(conjecture) سے علم میں کچھ اضافہ نہیں ہوتا۔'الحق' کے معنی ہیں 'معیارِ حق'۔'الحق' ہونے کا درجہ اللہ کے نازل کردہ فرمان کا ہے۔مثلاً اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ۔(اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ۔۲: ۱۴۷؛ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ۔۳:۶۰) وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ۔۔(۳۵:۳۱) اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ 'الحق' کا نازل فرمانے والا ہے۔ماضی میں اللہ کا نازل کردہ کلام بھی الحق تھا لیکن قرآنِ پاک شہادت دیتا ہے کہ ان میں تحریف کی جا چکی ہے۔(حوالہ ۵:۱۳،۱۵،۴۱) اسلئے اسے سند کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔فرمانِ الٰہی

کے مطابق اہلِ کتاب کے کسی نظریے کی تردید یا تصدیق نہیں کرنی چاہیے،صرف یہ کہنا چاہیے کہ جو اللہ نے نازل فرمایا ہے وہ حق ہے۔(فرمانِ الٰہی ہے:اور اہلِ کتاب سے مجادلہ نہ کرو مگر بطریقِ احسن---اور کہو کہ ہم اس پر ایمان لائے جو ہماری طرف نازل ہوا اور جو تمہاری طرف نازل ہوا--- ۲۹:۴۶) حال پر صرف قرآنِ پاک ہی سند کا درجہ رکھتا ہے۔کسی بھی نظریہ، اصول،عقیدہ ، روایت ،ارشاد،قول، گمان، خیال، احساس ،وہم، قیاس،تصور، تخّیل، تاثر،وجدان، واردات، حال، کشف، شہود،تشریح،تعبیر کی صداقت کا حتمی معیار قرآنِ پاک ہی ہے۔قرآنِ پاک جس کی تصدیق کرتا ہے وہ حق ہے،جس کو رد کرتا ہے وہ بغیر الحق ہے۔(۲:۶۱،۳:۲۱)قرآنِ پاک کے حوالے کے بغیر کی گئی بات محض رائے،قیاس،گمان یا ظن کا درجہ رکھتی ہے،اللہ کا فرمان ہے'اور ظنّ کسی کو حق سے مستغنی نہیں کر سکتا۔'(ماخوذ ۱۰:۳۶؛ ۵۳:۲۸) فرمانِ الٰہی سے انحراف الضلال (گمراہی) ہے۔فرمایا گیا ہے:الحق کے بعد ہے ہی کیا مگر گمراہی۔(۱۰:۳۲) قرآن پاک کے مقابل نظریات باطل ہیں۔(ماخوذ ۱۷:۸۱، ۲۱:۱۸)اللہ کے بارے میں بے سند بات کرنا اللہ پر افترٰی باندھنا (concoction) ہے،اور اس سے منع فرمایا گیا ہے۔(۴:۱۷۱) فرمانِ الٰہی ہے:اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ پر جھوٹ باندھے۔ وہ لوگ اپنے ربّ کے حضور پیش ہونگے،اور گواہی دینے والے کہیں گے،یہی ہیں جنھوں نے اپنے ربّ پر جھوٹ باندھا تھا۔سن لو اظالمین پر اللہ کی لعنت ہے۔(۱۱:۱۸)حکمِ الٰہی ہے:...اور اللہ پر نہ کہو مگر حق ...(۴:۱۷) فرمانِ الٰہی کو اپنی خواہش کے مطابق بنانا فسق ہے،اور اللہ فاسق ہی کو گمراہ کرتا ہے۔(۲:۲۶)ارشاد ہے: اور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے کے مطابق حکم نہ کرے،تو وہی کافر ہیں۔(۵:۴۴) ...اور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے کے مطابق حکم نہ کرے،تو وہی ظالم ہیں۔(۵:۴۵) ...اور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے کے مطابق حکم نہ کرے،تو وہی فاسق ہیں۔(۵:۴۷)...اوربے شك لوگوں میں سے کثیر فاسق ہیں۔(۵:۴۹) قرآن پاک اللہ کا نازل کردہ کلام ہے اور کتاب ہے۔(ذالك الکتاب لا ریب فیه۔۲:۲) اللہ نے اس کی حفاظت کا ذمہ خود لیا ہے۔(الحجر،۱۵:۹) یہ آیات کی اس ترتیب اور سورتوں کے اس مجموعے کا نام ہے جس کی تصدیق حضور نبی پاک ﷺ نے فرمائی اور شاہدین جس کی تصدیق کرتے آئے ہیں۔قرآن پاک ہی صداقت کا حتمی معیار ہے۔1

محمد فتح اللہ گلن

محمد فتح اللہ گلن جدید ترکی کے ایک مشہور سکالر ہیں۔مسئلہء تقدیر پر فتح اللہ گلن کے نظریات کی بنیاد چند روایات پر ہے۔وہ قرآن پاک کی آیات کی تفسیر اس طرح کرتے ہیں کہ وہ ان روایات کے مطابق ہو جائیں۔تقدیر پر انکے نظریات کیلئے محمد فتح اللہ گلن کی کتاب تقدیر-قرآن و سنّت کی روشنی میں کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ 2 اپنی کتاب کے صفحہ ۴۳ پر گلن صاحب لکھتے ہیں:''مسئلہ تقدیر وہ مسئلہ ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے اپنی توجہ کا زیادہ مرکز ٹھہرایا ہے۔کتب ستہ اس طرح کی احادیث سے بھری ہوئی ہیں۔لہٰذا ان احادیث کی روشنی ہی میں تقدیر کے موضوع پر بحث کرنی چاہئے کیونکہ یہ موضوع اس بات کا مستحق ہے کہ اس بارے میں تفصیل سے بحث کی جائے، بلکہ یہ لازم ہے۔''محمد فتح اللہ گلن کی کتاب: کے صفحہ ۴۹ پر رقم ایک روایت اس طرح ہے:

''عبد اللہ بن عمرو بن عاصم روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور آپ کے ہاتھ میں دو کتابیں تھیں۔آپ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو یہ دو کتابیں کیا ہیں؟ ہم نے عرض کیا، نہیں یا رسول اللہ ﷺ! ہم نہیں جانتے الا یہ کہ آپ ہمیں ان کے بارے میں خبر دے دیں۔آپ نے اس کتاب کے بارے میں فرمایا جو آپ کے دائیں ہاتھ میں تھی، کہ یہ ربّ العالمین کی طرف سے ایک کتاب ہے اور اس میں اہلِ جنت کے نام اور ان کے آباء اور قبیلوں کے نام ہیں اور پھر ان کے آخر میں مہر لگا دی گئی ہے کہ اب ان میں کبھی کوئی اضافہ ہوگا اور نہ ان میں کوئی کمی کی جائے گی۔پھر آپ نے اس کتاب کے بارے میں فرمایا جو آپ کے بائیں ہاتھ میں تھی کہ یہ بھی ربّ العالمین کی طرف سے ایک کتاب ہے اور اس میں اہل دوزخ کے نام اور ان کے باپوں اور قبیلوں کے نام ہیں اور پھر ان کے آخر میں مہر لگا دی گئی ہے کہ اب ان میں کبھی کوئی اضافہ ہوگا اور نہ ان میں کوئی کمی کی جائے گی۔آپ ﷺ کے صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! اگر یہ ایسا معاملہ ہے جو لکھا جا چکا ہے تو پھر عمل کیوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: درست ہو جاؤ اور قریب ہو جاؤ کہ جنت والے کیلئے اہلِ جنت کے عمل کے مطابق مہر لگا دی جائے گی خواہ اس

نے کوئی بھی عمل کیا ہو اور اہل دوزخ کیلئے اہل دوزخ کے عمل کے مطابق مہر لگادی جائے گی خواہ اس نے کوئی بھی عمل کیا ہوا۔پھر رسول اللہ نے اپنے ہاتھوں میں پھونک ماری اور انھیں جھاڑ دیا اور پھر فرمایا کہ تمھارا ربّ اپنے بندوں سے فارغ ہو گیا ہے۔ایک گروہ جنت میں جائے گا اور ایک گروہ جہنم رسید ہو گا۔"
(الترمذی، القدر ۸، المسند الاحمد حنبل ۱۲۷/۲۔)

اس روایت کی تشریح کے ضمن میں فتح اللہ گلن صاحب صفحہ ۵۱ پر رقمطراز ہیں:

"تقدیر اللہ تعالیٰ کا عالم بالا سے تمام امور کی طرف دیکھنا ہے جن کے ضمن میں ہمارا ارادہ بھی ہے۔اللہ تعالیٰ کا ابتداء و انتہاء کی طرف دیکھنا حال کے دیکھنے ہی کی طرح ہے۔۔۔ہمارے ارادے سے متعلق تمام افعال اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاں معلوم اور مقدر ہیں۔" اس تشریح میں گلن صاحب نے جو تصورِ زمان پیش کیا گیا ہے، جیسے کہ ہم دیکھیں گے وہ قرآنی تصور خدا کے ساتھ بالکل مطابقت نہیں رکھتا۔

اس سلسلہ کی ایک اور روایت، آیت کریمہ السنت بربکم کی وضاحت کے ضمن میں کتاب کے صفحہ ۵۷ پر اس طرح مذکور ہے:

"حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو پیدا فرمایا، پھر انکی پشت کو اپنے دائیں دست مبارک سے چھوا اور اس سے ان کی اولاد کو نکالا اور فرمایا: کہ ان لوگوں کو میں نے جنت کیلئے پیدا کیا ہے۔یہ اہل جنت جیسے عمل کریں گے۔پھر اللہ تعالیٰ نے انکی پشت کو چھوا اور اس سے ان کی اولاد کو نکالا اور فرمایا: کہ ان لوگوں کو میں نے جہنم کیلئے پیدا کیا ہے۔یہ اہل دوزخ جیسے عمل کریں گے۔ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ پھر عمل کیوں! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی بندے کو جنت کیلئے پیدا فرماتے ہیں تو اسے اہل جنت کے اعمال کی توفیق بھی فرما دیتے ہیں، حتیٰ کہ وہ جنتیوں کے اعمال میں سے کسی عمل پر فوت ہوتا ہے اور اسکی وجہ سے اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرما دیتے ہیں۔جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو دوزخ کیلئے پیدا فرماتے ہیں تو اسے اہل دوزخ کے اعمال میں سے کسی عمل پر لگا دیتے ہیں، حتیٰ کہ وہ اہل دوزخ کے عمل کرنے کی وجہ سے جہنم رسید ہو جاتا ہے۔(مسند احمد بن حنبل، ۱/

۲۷۲،تفسیر القرآن العظیم،ابن کثیر۲/ ۵۰۳۔)''

صفحہ۵۸پرحضرت عبداللہؓبن مسعوداورحضرت ابوہریرہؓ کے حوالے سے ایک اورروایت اس طرح بیان کی گئی ہے:

''بد بخت وہ ہے جواپنی ماں کے پیٹ میں بد بخت ہےاورخوش بخت وہ ہے جواپنی ماں کے پیٹ میں خوش بخت ہے۔(مجمع الزوائد،ہیثمی،۷/ ۱۹۳،المعجم الکبیرطبرانی، ۱۷۶/۳۔)''گلن صاحب اس کی وضاحت میں فرماتے ہیں:''بے شک سعیداور شقی وہی ہے جواپنی ماں کے پیٹ میں سعیدیاشقی تھا۔لیکن کتاب میں لکھی ہوئی یہ تحریر انسان کے ارادے کے سوااورکسی چیز سے حاصل نہیں ہوسکتی۔شقاوت یا سعادت کی ہرجہت انسان کےارادے ہی کی طرف لوٹتی ہے۔''

گلن صاحب صفحہ۷۹پررقمطراز ہیں:''بات یہ ہورہی تھی کہ کتابیں دو ہیں،ایک وہ جولوح محفوظ کی صورت میں لکھی ہوئی ہے،اور ہرچیز اپنے علمی وجود کے ساتھ لوحِ محفوظ میں موجود ہے،اوردوسری کتاب وہ ہے جس میں خارجی وجود کی صورت میں پیش آنے والے مسلسل ومتواترواقعات کودرج کیاجاتا ہےاوران میں سے جوارادی اعمال ہیں ان پرمحاسبہ ہوگا۔درجِ ذیل آیت کریمہ میں ان دونوں کتابوں کا ذکر ہے: ''اِنَّا نَحۡنُ نُحۡیِ الۡمَوۡتٰی وَ نَکۡتُبُ مَاقَدَّمُوۡا وَاٰثَارَھُمۡ ط وَکُلَّ شَیۡءٍ اَحۡصَیۡنٰہُ فِیۡ اِمَامٍ مُّبِیۡنٍ۔بے شک ہم مُردوں کوزندہ کریں گےاور جو کچھ وہ آگے بھیج چکےاور(جو)ان کے نشان پیچھے رہ گئے،ہم ان کوقلمبند کرلیتے ہیں۔اور ہرچیز کوہم نے کتاب روشن (یعنی لوح محفوظ) میں لکھ دیا ہے۔''(سورہ یٰسین آیت نمبر۱۲)

اس آیت میں اِمَامٍ مُبِیۡنٍ سے لوحِ محفوظ لئے جانے کا کوئی قرینہ نہیں۔چونکہ گلن صاحب نے مذکورہ بالاروایات کی بناءپر پہلے سے طے کرلیا ہوا ہے اس لئے وہ اس طرح تشریح کررہے ہیں۔

اپنی کتاب کے صفحہ۸۰پرگلن صاحب اس کی مزیدوضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:''ارادی افعال کی دوسری کتابت کے بارے میں حدیث شریف میں وارد ہے اور یہ کہ یہ پہلی تحریر کے بعد ہوتی ہے۔حدیث شریف یہ ہے:اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک تھی اوراس کے سوااورکوئی چیز نہ تھی،اللہ کاعرش اس وقت پانی پرتھااوراللہ نے کتابِ نصیحت میں سب کچھ لکھ دیا۔''

اس پرتبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:''پس اب ہرچیز کواس کے رونماہونے کی ترتیب کے ساتھ لکھ دیا جاتا ہےاور یہ تحریر تقدیر کا گویا دوسراپرتو ہے۔''غورطلب بات ہے،کتابِ نصیحت میں تو نصیحت لکھی گئی ہونی

چاہئے نہ کہ انسانوں کے اعمال اور چیزوں کے رونما ہونے کی ترتیب!

صفحہ ۷۴۔۷۵ پر سورہ الانفطار آیت ۱۱۔۱۲ ''کراماً کاتبین۔جو تم کرتے ہو وہ اسے جانتے ہیں۔' اور سورہ الاسراء آیت ۱۳ "اور ہم نے ہر انسان کے اعمال کو (بصورتِ کتاب) اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے اور قیامت کے روز (وہ) کتاب اسے نکال (دکھائیں گے) جسے وہ کھلا دیکھے گا۔'' کا حوالہ دینے کے بعد لکھتے ہیں:'' یعنی ایک علمی تحریر بھی ہے جس کا کوئی خارجی وجود نہیں ہے اور جس پر 'لوح محفوظ' کے نام کا اطلاق ہوتا ہے، اور ایک دوسری تحریر ہے جسے عالی مرتبت فرشتے لکھتے ہیں، اس کا خارجی وجود ہے۔اس میں انسان کا ہر عمل درج کرلیا جاتا ہے اور حقیقت میں یہ دونوں تحریریں حرف بحرف مکمل طور پر ایک دوسرے کے مطابق ہوتی ہیں اور ان میں سرِ مو فرق نہیں ہوتا۔یعنی ہر انسان صرف وہی عمل کرتا ہے جو پہلے سے اس کی تقدیر میں لکھا گیا ہوتا ہے، البتہ ہمارا ارادہ اس کتاب کو جس کا علمی وجود ہوتا ہے، خارجی وجود بھی عطا کر دیتا ہے۔۔۔[قیامت کو] عالی مرتبت فرشتہ کہے گا کہ اے میرے رب میں نے یہ لکھا ہے۔ربّ جلیل دوسری کتاب کو ظاہر کر کے فرمائیں گے کہ میں نے بھی یہی لکھا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ انسان یہ کرے گا۔ان میں سے ایک کتاب فرشتے کے ہاتھ میں ہوگی اور دوسری اللہ جل و شانہٗ کے دستِ مبارک میں۔۔۔'' گلن صاحب کی اپنی گھڑی ہوئی بات ہے اور صریحاً قرآن پاک کے خلاف ہے۔قرآنِ پاک اس کی قطعاً تصدیق نہیں کرتا۔مثلاً فرمایا گیا ہے:اور تم ہر امّت کو دوزانو بیٹھے ہوئے دیکھو گے۔ہر امّت اپنی کتاب کی طرف بلائی جائے گی۔آج تمھیں جزا دی جائے گی جو عمل تم کرتے تھے۔ہماری یہ کتاب تم پر حق بولتی ہے، ہم لکھتے جاتے تھے جو عمل تم کرتے تھے۔(الجاثیہ، ۴۵:۲۸۔۲۹) اسی طرح سورہ الاسراء (اس کا دوسرا نام سورہ بنی اسرائیل بھی ہے) میں فرمایا گیا ہے: اور ہر انسان کا نصیب ہم نے اس کے گلے میں لگا دیا۔اور اس کیلئے قیامت کے دن ایک کتاب نکالیں گے، جسے کھلا ہوا پائے گا۔پڑھ لے اپنی کتاب۔آج تو خود ہی اپنا حساب کرنے کیلئے کافی ہے۔(الاسراء، ۱۷:۱۳۔۱۴) سورہ یٰسین میں ارشاد ہے:بے شک ان میں اکثر پر قول حق ہو چکا ہے، تو وہ مانیں گے نہیں۔ (۳۶:۷) قولِ حق ہو چکنے سے کیا مراد ہے؟حق کے بعد ہے ہی کیا مگر گمراہی۔(سورہ یونس، ۱۰:۳۲) یہ قول حق ہے، یہ اصول جزا ہے۔جو قول حق کے انکار پر قائم

ہو جاتا ہے،اس پر قول حق واقع ہو جاتا ہے،وہ مانتا نہیں۔اللہ تعالیٰ نے کسی کی جزا پہلے سے نہیں لکھ رکھی،اصول جزا کو ضرور پہلے لکھ رکھا ہے۔سورہ یٰسین میں مزید ارشاد ہے:بیشک ہم مُردوں کو حیات دیں گے اور لکھ رہے ہیں جو انھوں نے آگے بھیجا اور جو نشان چھوڑ گئے۔(۳۶:۱۲) اعمال پہلے سے لکھے ہوئے نہیں ہیں،حال پر لکھے جا رہے ہیں۔اعمال کے دو حصے ہوتے ہیں:ایک حصہ وہ ہے جس میں توفیق ایزدی سے ایک راستہ اختیار کیا جاتا ہے،اور شعور کے ساتھ مقاصد کے حصول کیلئے سعی کی جاتی ہے۔دوسرا حصہ وہ ہے جس میں پیچھے آنے والوں کیلئے نقوش چھوڑے جاتے ہیں۔ان دونوں کی جزا بندے کو دی جائے گی۔گلن صاحب نے اوپر جن دو کتابوں کا ذکر کیا ہے،ان میں سے ایک میں قولِ حق یعنی اصول جزا لکھے ہوئے ہیں اور ان لوگوں کے اعمال درج کئے جا رہے ہیں جو ان کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں۔اور دوسری کتاب میں قولِ حق کی خلاف ورزی کی ممکنہ صورتیں درج ہیں اور ان لوگوں کے اعمال درج کئے جا رہے ہیں جو ان کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں۔قیامت تک ایک بھی شخص ایسا نہیں ہوگا جس کے اعمال ان میں سے کسی کتاب میں لکھے جانے سے رہ جائیں۔

محمد فتح اللہ گلن کے نظریات کا خلاصہ

۱۔ تخلیق کائنات سے پہلے ہر انسان کی تقدیر لوحِ محفوظ پر لکھ دی گئی ہے۔

۲۔ کسی کے سعید یا شقی،ہونے کا فیصلہ لوحِ محفوظ پر تخلیقِ کائنات سے بھی پہلے تحریر کیا جا چکا ہے۔اس حتمیت کے ساتھ کیا جا چکا ہے کہ جنتیوں کی کتاب میں ان کے نام،اور دوزخیوں کی کتاب میں ان کے نام،پوری تفصیل کے ساتھ درج کر دئے گئے ہیں اور آخر میں مُہر لگا دی گئی ہے۔قیامت تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

۳۔ بچہ اپنی ماں کے پیٹ ہی میں شقی یا سعید ہوتا ہے۔

۴۔ ہمارے ارادے سے متعلق تمام افعال اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاں ازل سے معلوم اور مقدر ہیں۔

۵۔ انسان صرف وہی عمل کرتا ہے جو پہلے سے اس کی تقدیر میں لکھ دیا گیا ہوتا ہے۔

۶۔ لوحِ محفوظ پر موجود تحریر علمی حیثیت رکھتی ہے،[یعنی سکرپٹ ہے۔] کراماً کاتبین کی لکھی ہوئی تحریر خارجی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اسوقت لکھی جاتی ہے جب انسان سکرپٹ کی مطابقت میں اعمال سرانجام دیتا ہے۔ ہمارا ارادہ اس کتاب کو جس کا علمی وجود ہوتا ہے،خارجی وجود عطا کر دیتا ہے۔

۷۔ گلن صاحب کی سورہ الاسراء کی آیتِ شریفہ ''اور ہم نے ہر انسان کے اعمال کو (بصورتِ کتاب) اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے اور قیامت کے روز (وہ) کتاب اسے نکال (دکھائیں گے) جسے وہ کھلا دیکھے گا'' کی تفسیر کا

حاصل یہ ہے کہ کائنات کی تخلیق سے بھی پچاس ہزار سال پہلے بنی آدم کی غیر جسمانی تخلیق ہوئی۔تخلیق کے ساتھ ہی علمِ الٰہی میں یہ جان لیا گیا کہ دنیا میں پیدائش کے بعد کوئی شخص کیا کیا اعمال سرانجام دے گا اور کس حیثیت (مسلم یا مجرم) سے دنیا سے رخصت ہوگا۔یہ تمام معلومات تبھی سے لوحِ محفوظ پر تحریر ہیں۔با الفاظ دیگر ہر ایک کا رول علم الٰہی میں ازل سے معلوم ہو چکا ہے۔اللہ کا علم نا قابل خطا ہے،اسلئے یہ رول مقدر ہو چکا ہے۔دنیا میں آتے وقت یہ رول لوحِ محفوظ سے لے کر فرد کے گلے میں لٹکا دیا جاتا ہے۔روزِ جزا کراماً کاتبین کی تیار کی گئی تحریر کا گلے میں لٹکائی گئی تحریر سے تقابل کر کے دکھادیا جائے گا کہ تم نے اپنے آزاد ارادے سے بالکل وہی کیا جو پہلے سے ازلی علمِ الٰہی کی بنیاد پر لوحِ محفوظ پر لکھ دیا گیا تھا۔

۸۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ماضی،حال اور مستقبل کی کوئی تقسیم نہیں۔وہ مستقبل کو بھی اسی طرح دیکھتا ہے جیسے ماضی اور حال کو۔

یعنی ازل سے ہی اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ قیامت تک پیدا ہونے کے بعد کوئی فرد بظاہر آزادیٔ ارادہ کے ساتھ کیا کیا اخلاقی افعال سرانجام دے گا اور کس حال میں دنیا سے رخصت ہوگا۔

۹۔ درج بالا نکات کے ساتھ یہ بات بھی شامل کر لی جائے کہ اللہ کا علم مطلق،نا قابل خطا (infallible) ہے۔اس میں کسی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔دعا،التجا،معجزہ کے حوالے سے بھی وہی واقع ہوتا ہے جو پہلے سے علمِ الٰہی میں معلوم اور مقدر ہوتا ہے۔

اللہ کے علمِ مطلق اور انسانی آزادی کا قرآنی تصور

محمد فتح اللہ گلن کے نظریۂ تقدیر کے درج بالا نکات سے انسانی آزادی کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے علمِ مطلق (Omniscience) کا جو تصور اخذ ہوتا ہے اسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

'اللہ تعالیٰ کو ازل ہی سے ہر ہر شے کا علم ہے۔قیامت تک پیدا ہونے والے افراد کے آزاد اخلاقی اعمال کا ازلی علم (eternal knowledge) بھی اس میں شامل ہے۔اللہ کا علمِ مطلق نا قابلِ خطا ہے۔'

مسلمان روایتی طور پر علمِ الٰہی کے بارے میں یہی عقیدہ رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ عقیدہ عین قرآن پاک کے مطابق ہے۔حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا عقیدہ قرآنی تعلیمات کے قطعاً برعکس ہے۔قارئین کو یہ جان کر حیرانی ہوگی کہ اللہ کے علمِ مطلق (Omniscience) کا جو نظریہ اوپر پیش کیا گیا ہے،اس میں اور سینٹ تھامس اکوائنس (۱۲۲۵۔۱۲۷۴) کے فلسفیانہ طور پر تشکیل دئے گئے علم مطلق (Omniscience) کے نظریئے میں جو Traditional Doctrine of Omniscience کے نام سے مشہور ہے،کوئی فرق نہیں۔مسلمانوں میں

اشاعرہ اور ماتریدیہ نے بھی اپنے اپنے انداز میں علمِ الٰہی کو ازلی قرار دیا۔الفارابی اور ابنِ سینا نے علمِ الٰہی کو اسطرح ازلی قرار دیا کہ اللہ تعالٰی کیلئے حال پر علمِ جزئیات کی گنجائش ہی نہیں بچتی۔3 جیسے کہ قارئین دیکھیں گے قرآنِ پاک میں اللہ کے علمِ مطلق کے کسی ایسے عقیدے کیلئے قطعاً کوئی گنجائش موجود نہیں۔آیئے دیکھتے ہیں کہ قرآن پاک سے اللہ تعالٰی کے علمِ مطلق کا کیا تصور اخذ ہوتا ہے۔

قرآن پاک انسانوں کو تین گروہوں میں تقسیم کرتا ہے۔ایک گروہ اس حال پر دنیا میں بھیجا جاتا ہے کہ علمِ الٰہی میں یہ بات طے ہوتی ہے کہ یہ لوگ پاک زندگی بسر کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوں گے۔یہ حضراتِ گرامی بھیجے ہی نمونہءِ ھدایت کی حیثیت سے جاتے ہیں۔اگر چہ یہ بات تمام انبیاء و رسل کے بارے میں درست ہے تاہم حضرت اسحاق علیہ السلام ،حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت یحیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، اور حضرت محمد ﷺ کا اس سلسلے میں خصوصی حوالہ دیا جا سکتا ہے۔4 ان انبیاء کرام کی پیدائش سے پہلے ان کا مقام اور شان بیان کر دی گئی۔یہ حضرات آزادیٔ ارادہ کے حامل ہوتے ہیں، لیکن ان کے بارے میں یہ طے ہوتا ہے کہ یہ کبھی رضائے الٰہی کے خلاف نہیں کریں گے۔بھول ہو سکتی ہے، لیکن ان کی بھول پھول بن جاتی ہے۔جیسے حضرت یونس علیہ السلام کی بھول سے ان کی قوم پر آیا ہوا عذاب ٹل گیا، اور انھیں ایمان لانا نصیب ہو گیا۔انھیں انتہائی مشکل مقامات سے گذارا جاتا ہے، جس سے ان کی فضیلتوں کا تعین ہوتا ہے۔جو لوگ کہتے ہیں کہ انسان کو صرف نیکی اور بدی کا شعور دیکر بھیجا گیا ہے، نیک اور بد بنا کر نہیں، 5 ان کی بات اس حد تک ضرور غیر درست ہے کہ کچھ لوگوں کو صالحین ہی کی حیثیت سے بھیجا جاتا ہے۔یہاں اس بات کا ذکر کرنا نہایت ضروری ہے کہ قرآنِ پاک کی تعلیمات کے مطابق ایک بھی شخص دنیا میں کبھی اس حال میں نہیں آیا اور نہ آئے گا جس کے متعلق علمِ الٰہی میں ازل سے طے ہو کہ وہ دنیا سے مجرم کی حیثیت سے رخصت ہو گا۔یہاں تک کہ یہ بات ابلیس، فرعون اور ابو لہب کے بارے میں بھی درست ہے۔قرآنِ پاک میں ارشاد ہے: وَ اَنَّ اللّٰہَ لَیۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ ۔بے شک اللہ بندوں پر کبھی ظلم نہیں کرتا۔(آلِ عمران،۳:۱۸۲)قرآنی تصورِ حیات کے مطابق، انسان کو زمین پر سزا کے طور پر نہیں بھیجا گیا۔یہ دیکھنے کیلئے بھیجا گیا ہے کہ توفیق (ability to do) کا استعمال، اللہ کی ہدایت کے مطابق عمل میں لایا جاتا ہے یا خواہش کے تحت۔توفیق استعمال ہوئے بغیر رہ نہیں سکتی۔توفیق کے استعمال سے رخ کا تعین ہوتا ہے۔رخ اختیار کرنے میں بندہ آزاد ہے۔انسان کو توفیق کے استعمال میں اختیار کئے گئے رخ (line of action) کی جزا ملتی ہے۔فضیلت عمل کو نہیں رخ کو ہے۔نتیجہ تو بندے کے ہاتھ میں ہوتا ہی نہیں۔نتیجہ وہ ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔نتیجے پر اللہ کی قدرت ہی کا نام

مشیت(Divine Will) ہے۔حشر اور جزا کی طرح نتیجے کو باذن اللہ ماننا بھی ایمان کالازمی جزو ہے۔اسی حال کا مستقبل بننے والا ہے۔پاک لوگوں کے اس گروہ کے علاوہ دیگر افراد اس حال پر دنیا میں آتے ہیں کہ ان کیلئے دونوں راستے کھلے ہوتے ہیں۔ہدایت بھیجنے اور حق کو روشن کرنے کی ذمہ داری خود اللہ نے لی ہے۔کسی کو جو توفیق دی گئی ہے،اسے توفیق عطا فرمانے والے سے بہتر کوئی جانتا نہیں۔اس سے بہتر کوئی جان نہیں سکتا کہ صداقت کا ثبوت دینے کیلئے کسی کو کس مقام سے گزارنا ہے۔سورہ آلِ عمران میں ارشاد ہے:اور وہ جو (مصیبت) تمھیں پہنچی جس دن دونوں فوجیں ملی تھیں تو وہ باذنِ اللہ تھی۔اور اس لئے کہ مومن دیکھے جائیں ،اور منافق بھی دیکھے جائیں۔۔۔"(۳:۱۶۵۔۱۶۶) اس گروہ میں سے بعض افراد کو پاکیزگی پر استقلال کی بدولت اللہ مخلصین کی صف میں شامل فرمالیتا ہے،جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ شیطان انہیں بہکا نہیں سکتا۔(القرآن،۱۵:۴۰)اب علمِ الٰہی میں یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ یہ ہمیشہ صحیح رخ اختیار کریں گے۔اسی طرح برائی اور فسق پر قائم ہو جانے کی بناء پر بعض لوگوں کو اللہ گمراہ کر دیتا ہے۔یہ ہدایت کیلئے اپنی عدم اہلیت کو ثابت کر دیتے ہیں۔اب ان کے بارے میں علم الٰہی میں طے ہو جاتا ہے کہ یہ کبھی ہدایت کو اختیار نہیں کریں گے۔(القرآن، ۲:۲۶؛ ۹:۸۰)لیکن ہوتا یہ سب حال پر ہے۔ابولہب اور اسکی بیوی کے بارے میں ازل سے یا ان کی پیدائش سے پہلے کبھی علمِ الٰہی میں متعین نہیں تھا کہ وہ مجرم کی حیثیت سے دنیا سے رخصت ہونگے۔جب انھوں نے اللہ کے رسول کی مخالفت پر قائم رہ کر اپنے لئے ہدایت کا دروازہ بند کرلیا تو انھیں مجرموں میں شامل کر دیا گیا اور ان کی مذمت پر مشتمل آیات نازل فرما کر اس کا اعلان بھی کر دیا گیا۔یہ آیات بھی پہلے سے بنی بنائی لوحِ محفوظ پر نہیں رکھی ہوئی تھیں۔ابلیس کا بھی یہی معاملہ ہے۔ازل سے ہی علم الٰہی میں ابلیس کے مردود ٹھہرائے جانے کا کوئی ثبوت قرآنِ پاک میں نہیں ہے۔ارشادِ الٰہی ہے:اَبیٰ وَاسْتَکْبَرَ وَ کَانَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ۔ منکر ہوا،اور تکبر کیا،اور کافرین سے ہو گیا۔(البقرہ،۲:۳۴) ایسا بھی نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کیلئے اس دشمنِ انسان کے بغیر دارالعمل وجود میں لانا ناممکن ہوتا۔یہ ضرور ہے کہ اس صورت میں اس کی شکل مختلف ہوتی۔ارشادِ باری ہے: وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ۔ تیرا ربّ کبھی بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔(فصلت،۴۱:۴۹)

لوحِ محفوظ کا قرآنی تصور

علمِ مطلق کے بارے میں گمراہ کن نظریات کا ایک سبب لوحِ محفوظ کا غیر قرآنی تصور بھی ہے۔اس غیر قرآنی تصور کے مطابق لوحِ محفوظ ایک کتاب ہے جس میں قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کے اخلاقی

اعمال کا علم لوحِ محفوظ کی تخلیق کے وقت سے درج ہے۔قرآن پاک لوحِ محفوظ کے اس تصور کی تصدیق نہیں کرتا۔لوحِ محفوظ کا یہ تصور قرآنِ پاک میں بیان کئے گئے تصور سے متصادم ہے۔قرآنِ پاک کے مطابق لوحِ محفوظ ایک کتاب ہے اللہ تعالیٰ کے پاس جو مشتمل ہے: ۱) گزری ہوئی امتوں کے احوال پر کہ ان میں سے کون کس حال پر دنیا سے رخصت ہوا۔ ۲) زمین و آسمان اور جو کچھ اس میں ہے، کے علم پر۔(الحج ۲۲:۷۰) ۳) امّ الکتاب یعنی ہدایت اور گمراہی کے ان اصولوں پر جن کے مطابق انسانی مقدر کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔(۱۳:۳۹؛ ۴۳:۱-۴) **6** لوحِ محفوظ کا یہ تصور انسان کی آزادئ ارادہ کے تصور سے متناقض ہے نہ ایمان کے کسی اور رکن کے ساتھ۔کتاب جو گزری ہوئی امتوں کی تقدیر کے علم پر مشتمل ہو، اس پر ان امتوں، اور افراد کا علم کیونکر ہو سکتا ہے جن کی تقدیر (destiny)، کہ وہ شقی ہیں یا سعید، ابھی متعین ہونا باقی ہے! سورہ طٰہٰ کی آیات ۴۹-۵۲ میں فرمایا گیا ہے: ''[فرعون] کہنے لگا: کون ہے تم دونوں کا ربّ اے موسیٰ (علیہ السلام)۔فرمایا: ہمارا ربّ وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی خِلقت عطا کی، پھر راہ سجھائی۔کہنے لگا: قرونِ اولیٰ کا حال کیسا ہے۔فرمایا: ان کا علم میرے ربّ کے پاس کتاب میں ہے۔میرا ربّ نہ بہکتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔'' اس آیت کا مفہوم یہ بنتا ہے: فرعون کہنے لگا، قرونِ اولیٰ والوں نے بھی وہی کیا تھا جو ہم کر رہے ہیں یعنی وہ بھی بعث بعد الموت اور جزا کے منکر تھے، ہم بھی اسکا انکار کر رہے ہیں۔وہ اب کس حال میں ہیں۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ان کا علم میرے ربّ کے پاس ہے، جو ان کو ان کے اعمال کی جزا دینے والا ہے۔ان کی انفرادی زندگی کا ہر ہر عمل اس کتاب میں لکھا ہوا ہے، ان کی اجتماعی زندگی کا ہر ہر پہلو اس کتاب میں لکھا ہوا ہے۔(بحوالہ تفسیرِ فاضلی منزل چہارم، فاضلی فاؤنڈیشن، بار دوم ۲۰۱۲ ص ۱۵۲-۱۵۳) گلن صاحب نے جس روایت کا ذکر کیا ہے کہ ''بچہ اپنی ماں کے پیٹ ہی میں شقی یا سعید ہوتا ہے۔'' قرآن پاک کی مطابقت میں اس روایت کا مطلب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے، لازم ہے کہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت وہ شقی ہو گا یا سعید۔دیگر کئی روایات کی تشریح بالکل جائز طور پر اس طرح کی جا سکتی ہے جو اللہ کے علم مطلق، انسان کے آزادئ ارادہ، اور دیگر ارکانِ ایمان سے قطعاً متصادم نہ ہو۔

سورہ البروج (۸۵) میں ارشاد ہے: بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيْدٌ۔فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ۔بلکہ وہ قرآنِ مجید ہے، جو لوحِ محفوظ میں ہے۔(۲۱-۲۲) اس سے یہ کیسے اخذ ہوتا ہے کہ قرآنِ پاک ازل سے لوحِ محفوظ پر لکھ دیا گیا تھا جہاں سے یہ جستہ جستہ نازل فرمایا جاتا رہا۔اگر فرعون، ہامان، نمرود، ابولہب سے متعلق آیات ازل سے لکھ دی گئی تھیں لوحِ محفوظ

پر تو پھر ہدایت اور ہادی بھیجے جانے اور بشارت و انذار کا کیا جواز رہ جاتا ہے! دعا کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔روایات کوحَکم مانے بغیر اور متن کے قریب رہتے ہوئے اسکی جو تشریح کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید خلوت کے حوالے سے لوحِ محفوظ میں موجود ہے۔یہ ایسی حفاظت ہے جس سے بہتر حفاظت ممکن ہی نہیں، کہ علیمِ مطلق کے علم سے یہ حفاظت ہو رہی ہے۔(تفسیرِ فاضلی منزل ہفتم، فاضلی فاؤنڈیشن، بار اوّل ۱۹۹۸ء ص ۴۰۷) (دیکھئے حوالہ نمبر ۵)

سورہ الحج میں ارشاد ہے: اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمَآءِ وَالْاَرضِ ط اِنَّ ذَالِکَ فِی کِتَابٍ ط اِنَّ ذَالِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْر۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ کو علم ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے۔یہ سب کتاب میں ہے بے شک یہ اللہ پر آسان ہے۔(۲۲:۷۰) اس آیت پاک سے بھی کہیں یہ اخذ نہیں ہوتا کہ تخلیق کائنات سے لیکر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہر چیز جس میں انسان کے ارادی اعمال بھی شامل ہیں لوحِ محفوظ پر لکھ دی گئی ہے۔اس سے جو بات بجا طور پر اخذ ہوسکتی ہے وہ تو یہ ہے کہ اللہ ہر شئے کا خالق ہے۔اس سے بڑھ کر ہر شئے کا علم کسی کو نہیں ہوسکتا۔اس نے ہر شئے کی تخلیق میں ایک قدر رکھی ہے۔ہر شئے کا ایک مقصدِ تخلیق ہے۔جن و انس کو شعور دیا گیا ہے۔وہ اس شعور کو استعمال کرتے ہوئے حق کو مانتے ہیں یا حق کے خلاف کرتے ہیں، ہر ایک کا نامۂ اعمال حال پر تیار ہو رہا ہے۔یہ اللہ تعالیٰ کیلئے آسان ہے۔جو حق کو مان لے اس کا بھلا ہو جاتا ہے، جو حق کو نہ مانے وہ خلافِ حق کرنے سے بچ نہیں سکتا، یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے۔(تفسیرِ فاضلی منزل چہارم، ص ۲۵۸)

گلن صاحب نے اپنی کتاب میں ان آیات کا بھی حوالہ دیا ہے جن میں 'کتابِ مبین' کا ذکر ہے۔آیئے دیکھتے ہیں قرآنِ پاک میں اس کا کہاں اور کس تناظر میں ذکر ہے۔

سورہ مائدہ میں ارشاد ہے:۔۔۔قَدْ جَاءَ کُمْ مِنَ اللّٰہِ نُوْرٌوَّ کِتَابٍ مُبِیْن ۔(۵:۱۵) اس آیتِ کریمہ میں کِتَابٍ مُبِیْن سے صریحاً قرآنِ پاک مراد ہے۔

سورہ الانعام میں ذکر ہے: ''غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں، انہیں وہی جانتا ہے۔اسے علم ہے جو بر و بحر میں ہے۔اور جو پتّا گرتا ہے وہ اس کا علم رکھتا ہے، اور زمین کی اندھیریوں میں کوئی دانہ نہیں اور نہ کوئی رطب اور نہ کوئی یابس جو کتابِ مبین میں نہ ہو۔(۶:۵۹) اللہ تعالیٰ نے سورہ الحجر میں ارشاد فرمایا ہے: اور کوئی شے نہیں جس کے ہمارے پاس خزانے نہ ہوں اور ہم اسے ایک معلوم

اندازے سے ہی اتارتے ہیں۔ (۱۵ : ۲۱) آسمانوں اور زمین کے خزانے سب اللہ کے ہیں۔ کس حال پر لوگوں کو معرفت الٰہی میں کیا آسانیاں عطا کرنی ہیں یہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اسے علم ہے جو خشکی میں ہے اور جو پانی میں ہے۔ پتّا بھی اگر جھڑتا ہے تو اسے اس کا علم ہے۔ زمین کے اندر کوئی دانہ کہیں ہو اللہ کو اس کا علم ہے۔ کوئی تر یا خشک ایسا نہیں جو کتابِ مبین میں نہ ہو۔ غیب کی کنجیاں علیمِ مطلق نے اپنے پاس رکھی ہی اس لئے ہیں کہ معرفتِ الٰہی میں لوگوں کو جو جو آسانیاں کسی حال پر عطا کرنا ضروری ہوں، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتی رہیں۔ اللہ کا علم ہر مقام پر انسان کی مدد کر سکتا ہے اور دوسرا کوئی علم ہر مقام پر کسی کا مددگار نہیں ہو سکتا۔ (تفسیرِ فاضلی، منزل دوم، بار دوم ۱۹۹۶، ص ۱۱۷۔۱۱۸) سورہ یونس میں ارشاد ہے: "۔۔۔اور تم لوگ کوئی بھی عمل کرو ہم تم پر گواہ ہوتے ہیں، جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو۔ اور تمہارے ربّ سے ذرّہ بھی چھپا ہوا نہیں، زمین میں اور آسمان میں، نہ اس سے چھوٹا اور نہ بڑا مگر کتابِ مبین میں ہے۔ (۱۰ : ۶۱) ۔۔۔ ہماری نیت بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے ہے، ہمارا عمل بھی اس کے سامنے ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے اور جہاں ہو رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے زمین اور آسمان میں کوئی ذرہ بھی چھپا ہوا نہیں، چھوٹی اور بڑی کوئی شے بھی اس سے مخفی نہیں، تو مکذبین کے احوال بھی اس کے سامنے ہیں۔ کتابِ مبین میں سب کچھ ہے۔ ماننے والوں کیلئے بشارت موجود ہے، نہ ماننے والوں کیلئے انذار موجود ہے۔ کتابِ مبین میں سب کچھ روشن کر دیا گیا ہے۔ کوئی فیض پاتا ہے یا نہیں پاتا، اپنے کئے کی جزا پائے گا۔ (تفسیرِ فاضلی، منزل سوم، بار دوم ۲۰۱۰، ص ۳۲۔۳۳)

کیا ان آیات سے کتابِ مبین (لوحِ محفوظ) کا کوئی ایسا تصور اخذ ہوتا ہے جس میں تخلیقِ کائنات سے قیامت تک آنے والے انسانوں کا ہر ہر ارادی عمل، اور ہر ہر فرد کا انجام (destiny) ازل ہی سے اس حتمیت کے ساتھ درج ہو کہ تا قیامت کسی توبہ، التجا، کفارہ، عبادت، سخاوت یا خدمت سے اس میں تبدیلی کا مطلقاً کوئی امکان نہ ہو! آدم علیہ السلام کی لباسِ بشریت میں تخلیق سے پہلے ہی علمِ الٰہی نے ذریتِ آدم کے اس گروہ کو متعین کر لیا جسے پیدا ہی دوزخ کیلئے کیا گیا ہے، کیا ایسا کوئی تصور درجِ بالا آیات سے کہیں اخذ ہوتا ہے! (قطعاً نہیں۔) کیا یہ تصور اللہ کے اس فرمان "تیرا رب اپنے بندوں پر قطعاً ظلم نہیں کرتا" سے صریحاً متصادم نہیں!

رضا اور مشیت (Divine Pleasure & Divine Will)

اللہ کی رضاء (Divine Pleasure) اور مشیّت (Divine Will) میں فرق ہے۔ مسئلۂ تقدیر اور بالخصوص اللہ کی قدرتِ مطلق (Omnipotence) اور انسانی آزادی (human freedom) میں

توافق کے مسئلہ پر مباحث میں بہت زیادہ ابہام اس فرق کو سمجھ نہ سکنے یا ملحوظ نہ رکھ سکنے سے پیدا ہوتا ہے۔وحی ء الٰہی ہمیشہ سے رضاء الٰہی کو جاننے کا ذریعہ اور انبیاء کرام اس کا عملی نمونہ رہے ہیں۔ چنانچہ اللہ کی رضاء ہمیشہ واضح ،پیشگی طور پر معلوم اور متعین ہوتی ہے اور شاہدین کی صورت میں اسکا عملی نمونہ بھی معلوم ہوتا ہے۔اس کے مقابل مشیت، نتائج پر اللہ کی مطلق قدرت کا نام ہے۔انسان نیت کرنے میں آزاد ہوتا ہے۔نیت، اللہ کی رضا کو پانے کی ہوسکتی ہے یا اپنی خواہش کی پیروی کی۔توفیق (ability to do) کے استعمال سے رخ کا تعین ہوتا ہے، اور رُخ اختیار کرنے کی آزادی ہونا لازم ہے۔رخ دو ہی ہیں۔رخ، ظلمات سے نور کی طرف ہوتا ہے یا اسکے برعکس۔اگر توفیق شاہدین کے اتباع میں استعمال میں لائی جارہی ہے تو اللہ کی رضا مقصود ہے اور رخ ظلمات سے نور کی طرف ہے، اگر اپنی پسند اور ناپسند کو اہمیت دی گئی ہے تو رخ اسکے برعکس ہے۔زندگی، توفیق اور آزادی ء ارادہ محض اللہ کی عطا (Bounty) ہیں، انسان ان میں سے کسی کا اکتساب نہیں کرتا۔توفیق استعمال ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔اللہ کی رضا کے مطابق رخ اختیار کرنا اس کا صحیح استعمال ہے اور اللہ کی رضا کا علم معلوم، معروف declared, determined, defined, and well defined ہوتا ہے۔توفیق کے استعمال میں صحیح رخ اختیار کر کے انسان اپنی صداقت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔یہی اکتساب ہے۔نتائج باذن اللہ ہوتے ہیں۔نتائج مطلق طور پر اللہ کی مشیّت کے تابع ہوتے ہیں اور مشیّت معلوم ہوتی ہے نہ معروف اور نہ لازماً متعین۔اللہ کی مشیت اسکا حکم نہیں ہوتی۔اللہ کی قدرت انسانی آزادی کو محدود تو کرسکتی ہے اور معطل بھی، لیکن توفیق کی حد تک ہی حق عاید ہوتا ہے۔سورہ الانسان (۷۶) کی آیت نمبر ۳۰ میں فرمایا گیا ہے وَمَا تَشَاۗؤُنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۔''اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔بیشک اللہ علیم وحکیم ہے۔'' اسی طرح سورہ التکویر (۸۱) آیت نمبر ۲۹ میں فرمایا گیا ہے:''اور تم نہیں چاہو گے مگر وہ جو اللہ رب العالمین چاہے۔'' چاہنے کا تعلق نتائج سے ہوتا ہے۔نتائج وہ نہیں ہونگے جو بندہ چاہے گا، نتائج وہ ہونگے جو اللہ چاہے گا۔یہ دونوں آیات ایسے مقام پر ہیں جہاں ہدایت اور گمراہی کی بات ہورہی ہو۔سورہ الانسان میں محولہ بالا آیت سے پہلے فرمایا گیا ہے: یہ قرآن پاک تو تذکرہ ہے تو جو چاہے اپنے رب کی طرف رہ لے۔سورہ التکویر میں مذکورہ آیت سے پہلے فرمایا گیا ہے: یہ قرآن پاک تو عالمین کے لیے نصیحت ہے، اس کے لئے جو صراط مستقیم کو اختیار کرنا چاہے۔ یہ آیات ہدایت کا راستہ اختیار کرنے کی نصیحت اور یاد دہانی پر مشتمل ہیں اور انسان ہدایت کا راستہ اختیار کرنے میں آزاد ہے۔مگر یہ بھی بتادیا گیا ہے کہ محض انسان کے چاہنے سے اسے ہدایت عطا نہیں ہوجاتی۔ہدایت یافتہ ہونے کیلئے ضروری ہے کہ انسان طلب ہدایت رکھتا ہو۔(یہ نیت ہے۔) اور اللہ

تعالیٰ کی طرف رجوع لانے والے کا اتباع کرے ۔(یہ توفیق کا استعمال ہے،اور توفیق کے استعمال سے رُخ کا تعین ہوتا ہے ۔) گمراہ وہ ہوتا ہے جو اپنی خواہش کی پیروی کرے اور فاسق ہو جائے ۔ ہدایت و ضلالت نتائج ہیں اور اللہ کی مشیت کے تابع ہیں،لیکن راستہ انسان اختیار کرتا ہے جو چاہے ۔اللہ تعالیٰ کا کام بڑے علم سے ہوتا ہے،بڑی حکمت سے ہوتا ہے ۔مسئلۂ تقدیر پر اظہارِ خیال فرمانے والے اکثر حضرات رضائے الٰہی اور مشیتِ الٰہی میں فرق ملحوظ نہ رکھ سکنے کی وجہ سے سورہ الانسان اور سورہ التکویر کی درج بالا آیات کے ترجمہ اور تشریح میں درست نتائج اخذ کرنے سے قاصر رہے ہیں ۔وجہ صاف ظاہر ہے کہ روایات کو حَکم ماننے کی صورت میں مذکورہ بالا متشابہہ آیات کی محکمات سے ہم آہنگ صحیح تشریح تک پہنچنا ممکن ہی نہیں ۔بعض اوقات کتابوں میں لکھا ہوتا ہے:'ایک ذرّہ بھی اللہ کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کرتا ۔'بالعموم اسے قرآنِ پاک کی آیت کا ترجمہ سمجھ لیا جاتا ہے حالانکہ یہ بات درست نہیں ۔اس بات کو ماننے کی صورت میں احسن عمل اور قبیح عمل میں فرق قائم رکھنا ممکن نہیں رہتا۔قرآن پاک کی آیت کا ترجمہ اس طرح ہے:ایک پتّا بھی جو گرتا ہے،اللہ کو اس کا علم ہوتا ہے ۔(۶:۵۹) ہر شے اللہ کے احاطۂ علم میں بھی ہے اور احاطۂ قدرت میں بھی،لیکن وہ معروف کا امر کرتا ہے،اور منکر سے منع کرتا ہے ۔اللہ کی مشیت کا علم کسی کو اسی قدر ہو سکتا ہے جو اللہ کسی کو عطا کرنا چاہے،اللہ کی رضا کا علم عام ہے اور سب کیلئے ہے ۔سورہ الکہف (۱۸: ۶۵۔۸۲) میں اللہ کے ایک بندے کا ذکر ہے جو مسلم روایت میں حضرت خضر علیہ السلام کے نام سے مشہور ہیں ۔فرمایا گیا ہے:ہمارے بندوں میں سے ایک بندے جسے ہم نے اپنی رحمت اور اپنے پاس سے ایک خاص علم (علم لدُنی) سے نوازا ۔(۱۸:۶۵) حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی تھے،رضائے الٰہی کے علم کے حامل اور اسکا نمونہ تھے،جبکہ حضرت خضر علیہ السلام کو جس علم لدُنی سے نوازا گیا تھا وہ مشیت الٰہی کا علم تھا ۔7

ازل اور ابد (Eternity and Everlastingness)

تقدیر سے متعلق مباحث میں زمان کے تصورات بھی الجھاؤ کا باعث بنتے ہیں ۔ ازلیت یا قِدم (eternity) آنات اور لمحات میں تقسیم پذیر زمان کے اس تصور کیلئے بولا جاتا ہے جس کا کوئی مخصوص آغاز متصور نہ ہو ۔ابد (unending duration; everlastingness) اسی زمان کی نا اختتام پذیری کیلئے استعمال کیا جاتا ہے ۔قرآن پاک اللہ تعالیٰ کیلئے ازلی/قدیم کا لفظ استعمال کرتا ہے نہ ابدیت کا ۔'ابد' کا لفظ بھی قرآن پاک میں انسانوں کے حوالے سے استعمال ہوا ہے ۔جب آپ اللہ تعالیٰ کیلئے ازلی یا قدیم علم کی غیر قرآنی اصطلاحات استعمال کریں گے تو لامحالہ الجھاؤ میں پھنس جائیں گے ۔بعض لوگ زمانِ الٰہی کو انسانی زمان

سے ممیّز کرنے کیلئے 'ابدی حال' (eternal now; pure duration) کے الفاظ استعمال کرتے ہیں جس میں لامحدود ماضی بھی موجود ہوتا ہے اور نامختتم پذیر مستقبل بھی اپنے لامحدود امکانات کی صورت میں موجود ہوتا ہے۔ بعض لوگ اللہ اور زمانے میں عینیت ثابت کرتے ہوئے اللہ کو زمانہ اور زمانے کو اللہ قرار دیتے ہیں۔ یہ تمام غیر قرآنی تصورات ہیں اور اللہ ان سے پاک اور ماوراء ہے۔ اکثر مفسرین، متکلمین اور فلاسفہ کے اوپر بیان کئے گئے تصورات میں یہ الجھاؤ موجود ہے۔ محمد فتح اللہ گلن آغازِ کائنات کو ماضی میں لامحدود نہیں سمجھتے، لیکن جب وہ خدا کیلئے ازلی یا قدیم علم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے ان کیا مراد ہے! کیا وہ ابن سینا کی طرح خدا کیلئے حال پر علمِ جزئیات سے انکار نہیں کر رہے! محمد فتح اللہ گلن کہتے ہیں خدا کیلئے ماضی، حال، مستقبل کی کوئی تقسیم نہیں۔ مستقبل بھی اسی طرح ہے جیسے ماضی۔ پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھے ہوئے شخص کی مثال دی جاتی ہے کہ جو اسکے سامنے ہے اسے بھی وہ اسی طرح دیکھتا ہے جیسے جو اس کے پیچھے ہے۔ چوٹی پر بیٹھے ہوئے شخص کو نہ تو ماضی پر قدرت ہوتی ہے نہ مستقبل پر، وہ تو ایک ہمیشہ سے بنی بنائی کائنات کو صرف دیکھ ہی سکتا ہے۔ اس سے بڑی جبریت اور کیا ہو سکتی ہے کہ اب اللہ بھی کچھ کر نہیں سکتا، جو کچھ اسے کرنا تھا وہ ہمیشہ ہمیشہ پہلے کر چکا۔ کیا یہ ہے خدا کا تصور اسلام میں! یہ تو deism ہے، اسلام کا تصورِ خدا تو یہ نہیں ہے۔ خدا کے بارے قرآن کا تصور یہ ہے کہ ''کوئی شئے اسکی مثل نہیں۔'' شئے کی حقیقت تعین ہے۔ خدا، زمان، مکان اور دیگر تمام تعینات کا خالق ہے اور خود تعینات کے ساتھ کسی بھی مماثلت سے پاک ہی ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفتِ ارادہ اور صفت علم

صاحبِ ارادہ ہونا اللہ کی شان ہے۔ قرآنِ پاک سے صرف چند مقامات بطورِ حوالہ پیش ہیں۔ ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰہَ یَحۡکُمُ مَا یُرِیۡدُ ط (المائدہ، ۵:۱)؛ اِنَّ اللّٰہَ یَفۡعَلُ مَا یُرِیۡدُ ط (الحج، ۲۲:۱۴) اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ ط (ھود، ۱۱:۱۰۷) خدا کے علم کی کوئی ایسی تعریف جس کا حاصل یہ ہو کہ خدا نے ایک ہی بار ارادہ کر لیا جو بھی کرنا تھا، اور بس۔ تو یہ سیدھا سیدھا خدا کی صفت ارادہ سے انکار ہے۔ اسی طرح خدا کے علم کے بارے میں یہ کہنا کہ خدا نے ہمیشہ ہمیشہ سے یکبارگی جان لیا جو کچھ جاننا تھا اور اب ہمیشہ ہمیشہ اسی علم کے مطابق ہوتا رہے گا، یہ خدا کی صفت علم کا انکار اور اس کے تعطل کے مترادف ہے۔ ارشاد ہے: وہ خَبِیۡرٌۢ بَصِیۡرٌ ہے۔ (الشوریٰ، ۴۲:۲۷) نیت کی خبر رکھتا ہے، عمل کو دیکھتا ہے۔ وہ یہ بھی فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ط ''۔۔۔بے شک اللہ دیکھ رہا ہے جو عمل تم کرتے ہو۔'' (البقرہ، ۲:۱۱۰) وہ یہ بھی فرماتا ہے ''اور تم لوگ کوئی بھی عمل کرو ہم تم پر گواہ ہوتے ہیں جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو۔ (سورہ یونس، ۱۰:۶۱) وہ یہ بھی فرماتا

ہے:ایک پتّا بھی جوگرتا ہے،اسے اس کاعلم ہوتا ہے۔(سورہ الانعام،۶:۵۹)وہ یہ بھی فرماتا ہے:اسے علم ہے جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس میں سے نکلتا ہے،اور جو آسمان سے اترتا ہے اور جو اس میں چڑھتا ہے،اور وہی رحیم وغفور ہے۔۔۔عالم الغیب جس سے ذرّہ بھر بھی کچھ غائب نہیں آسمانوں میں اور نہ زمین میں، اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ اس سے بڑی جو کتابِ مبین میں نہ ہو۔(سورہ سبا،۳۴:۲۔۳) ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ خدا کے علم کو قدیم یا ازلی (eternal) کہنا بھی اس کی شان کے منافی ہے کیونکہ اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ خدا نے ہمیشہ ہمیشہ پہلے بس ایک ہی بار جان لیا جو جانا جا سکتا تھا،اور جو کچھ جان لیا وہ لوح محفوظ پر لکھ بھی دیا۔ازل سے ابد تک اسکے جاننے کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔یہی نظریہ خدا تعالیٰ کی صفتِ علم کے انکار پر منتج ہوتا ہے۔خدا کے علم کا یہ نظریہ،اور خدا کے ارادے کا یہ نظریہ،دونوں قرآن پاک کی تعلیمات سے متناقض،اور خدا کی شان کے منافی ہیں۔محمد فتح اللہ گلن اور اس قبیل کے دیگر افراد مثلاً حضرت ابوالحسن الاشعری،مولانا مودودی،ڈاکٹر اسرار احمد، جاوید احمد غامدی، ڈاکٹر ذاکر نائیک وغیرہ اسی نظریہ کے حامی اور اسی تناقض کا شکار ہیں۔اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنی ذات یا صفات کیلئے کہیں 'قدیم' کا لفظ استعمال کرنا پسند نہیں فرمایا۔نہ ہی یہ اللہ تعالیٰ کے کسی اسمِ پاک کا ترجمہ ہے۔'قدیم' کا لفظ قرآن پاک میں صرف دو مقامات پر آیا ہے۔جب حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں سے فرماتے ہیں کہ مجھے یوسف (علیہ السلام) کی خوشبو آرہی ہے،اگر تم یہ نہ کہو کہ میں سٹھیا گیا ہوں۔تو ان کے بیٹے کہتے ہیں۔ تَاللّٰہِ اِنَّکَ لَفِیْ ضَلٰلِکَ الْقَدِیْم ۔خدا کی قسم! آپ اپنے اسی قدیم خبط میں مبتلا ہیں۔ (سورہ یوسف،۱۲:۹۵) دوسرا مقام وہ ہے جب چاند کی منزلوں کے بارے میں فرمایا جارہا ہے: وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۔اور قمر کیلئے منازل ٹھہرائیں،حتیٰ کہ کھجور کی قدیم شاخ کی مانند ہوگیا۔(سورہ یٰسین،۳۶:۳۹) 'قدیم' / 'ازلی' فلسفیانہ اصطلاح eternal کا ترجمہ ہے۔اسکا حاصل خدا کے علمِ جزئیات سے انکار ہے۔کمالِ مطلق (Absolute Perfection) بھی فلسفیانہ اصطلاح ہے جس کا حاصل خدا کی صفت ارادہ کا انکار ہے۔قرآن پاک سے خدا تعالیٰ کیلئے ان تصورات کو اخذ نہیں کیا جا سکتا۔اشاعرہ،معتزلہ،مسلم فلسفی الفارابی،بالخصوص ابن سینا کے نظریات میں اللہ کے علم مطلق کے لئے ازلی/قدیم علم کی اصطلاح اور کمالِ مطلق کی اصطلاح،اور 'ارادہ' کی تعریف ارسطو (۳۸۴۔۳۲۲ق م) سے لی گئی ہیں۔ابن سینا (۹۸۰۔۱۰۳۷ء) نے تو اپنے فلسفے میں ارسطو کے نظریات کو قبول کرتے ہوئے خدا کی صفت ارادہ کو خدا کی صفت علم کے مترادف ٹھہراتے ہوئے خدا کی صفت ارادہ سے انکار کیا،جس سے اسلام کے تمام بنیادی عقائد پر زد پڑی۔(ارسطو نے یہ کہا تھا ارادہ ہمیشہ کسی نقص کو دور کرنے کا ہوتا ہے یا کسی کمی کو پورا

کرنے کا۔کامل واکمل ھستی کے بارے میں ایسا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔لہٰذا صاحب ارادہ ہونا خدا کی شان کے منافی ہے۔امام غزالی صاحب نے فرمایا کہ دو مطلق طور پر یکساں متبادلات میں سے ،بغیر کسی اصول ترجیح کے، کسی ایک متبادل کو اختیار کر لینے کی صفت کا نام ارادہ ہے۔ذات باری کے سامنے یہ دو متبادل، کائنات کو تخلیق کیا جائے یا کائنات کو تخلیق نہ کیا جائے ،مطلق یکساں طور پر موجود تھے۔خدا کائنات کو تخلیق نہ کرتا،اس کی شان میں کوئی نہ ہوتی،اس نے بنا دیا،اس کی شان میں کوئی اضافہ نہیں ہو گیا۔بغیر کسی اصول تخصیص کے اس نے چاہا اور دو متبادلات میں سے ایک کا انتخاب کر لیا۔ابن سینا وغیرہ کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اس نے تخلیق کائنات کے لئے ایک خاص لمحے کا انتخاب کس بنا پر کیا۔اس کا جواب بھی یہی ہے کہ تمام لمحے اس کی صفت ارادہ کیلئے مطلق طور پر یکساں تھے،اس نے جس لمحے کا چاہا،بغیر کسی وجہ کے انتخاب کر لیا۔8 ارسطو سے تقریباً چودہ سو سال بعد امام غزالی (۱۰۵۸۔۱۱۱۱ء) نے ارسطو کی ارادۂ الٰہی کی تعریف کو مضبوط دلائل کے ساتھ رد کر کے ارادۂ الٰہی کی قرآن پاک سے مطابقت رکھتی ہوئی ایسی تعریف دی جس سے خدا کی صفت ارادہ کا انکار ممکن نہیں رہتا۔اس طرح اس نے ابن سینا کے نظریات کا بھی استرداد کیا۔لیکن اس بات کا کیا کیا جائے کہ تقریباً مزید نو صدیاں گذر جانے کے باوجود مسلمان علماء ابھی تک ارسطو کے اثر سے باہر نہیں آ سکے اور نا دانستہ طور پر ازلی علم یا قدیم علم کی اصطلاحات استعمال کر کے،علم الٰہی کی وہی تعریف قبول کرتے چلے آ رہے ہیں جو اللہ کی صفت ارادہ کے عملاً انکار کے مترادف ہے۔جس سے نہ خدا آزاد رہتا ہے نا انسان۔محمد فتح اللہ گلن (ذاکر نائیک، جاوید احمد غامدی ، ڈاکٹر اسرار احمد و دیگر بہت سے لوگ) روایات کی بنیاد پر یا انکے بغیر آج بھی انھیں نظریات کا پرچار کرتے چلے آ رہے ہیں۔روایات کی کتب کو صحاحِ ستہ کا نام دیکر بظاہر روایات کو قرآن پاک پر حَکم بنا دیا جاتا ہے ،غور کرنا چاہئے کہ ان پر کس قدر گہرے غیر اسلامی اثرات مرتب ہیں۔الحکمت کے ایک پچھلے شمارے میں ہم نے صحاح ستہ میں شامل ایک روایت "لَا تَسُبُّو الدَّھر فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الدَّھر ۔(زمانے کو برا نہ کہو کہ اللہ ہی زمانہ ہے۔) کا جائزہ لیا ہے جسے حضرت علامہ اقبال جیسے جید سکالر نے اپنی کتاب 'تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ' میں اپنے خودیٔ مطلق کے تصور کی بنیاد بنایا ہے جو انکے فلسفیانہ فکر کی بنیاد ہے۔ہم نے اپنے مذکورہ مضمون میں یہ دکھایا ہے کہ یہ حدیث قرآن پاک میں خدا کے تصور سے صریحاً متصادم ہے اسلئے حضور ﷺ کی فرمائی ہوئی بات قطعاً نہیں ہو سکتی۔9

دینی موضوعات پر کام کرنے والوں کو اس بات کا بہت دھیان رکھنا چاہئے کہ کوئی اصطلاح نیوٹرل نہیں ہوتی۔جس نظام فکر سے آپ کوئی اصطلاح قبول کرتے ہیں اسکی مابعد الطبیعات اس کے ساتھ موجود ہوتی

ہے۔ہم نے اس بات کو اپنے کسی دوسرے غیر مطبوعہ مضمون میں اس طرح بیان کیا ہے: Ideas thrive upon terms and travel in history. If they are false they go on colouring the understanding and interpretation of other ideas. At times it takes centuries for someone to identify them and straighten them.) ہمارے جدید اور قدیم علماء، نیز جدید تعلیمیافتہ اور مذہبی علوم کے ماہرین دونوں میں اکثر اس شعور کا سخت فقدان دکھائی دیتا ہے۔محمد فتح اللہ گلن کے بارے میں بھی یہ بات بالکل درست ہے۔

ایسے لگتا ہے کہ ان کے ذہن میں کہیں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ خدا کو حال پر انسانی اعمال کا علم ہوتا ہے، انسان کا نصیب حال پر فرد کے عمل کے بعد اللہ کے علم میں آتا ہے، تو اس سے خدا کے علم کے انکریمنٹل (incremental) ہونے کو ماننا پڑے گا، یعنی یہ کہ خدا کے علم میں اضافہ بھی ممکن ہے، اور یہ بات انھیں خدا کے کمال مطلق اور علمِ الٰہی کی ازلیت کے تصور کے منافی نظر آتی ہے۔حالانکہ علمِ الٰہی کی ازلیت کا تصور ہی درست نہیں۔جس طرح علامہ محمد اقبال صاحب برگساں کے تصورِ زمانِ دوراں (pure duration) سے متاثر ہوئے، قرآن پاک میں اسے قبول کرنے کا کوئی جواز نہ پاتے ہوئے حدیث کی طرف متوجہ ہوئے، خدا اور زمانے کے تعلق کے موضوع پر ایک ہی راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی پانچ متناقض روایات میں سے اس کا انتخاب کیا جو صریحاً قرآن پاک سے متصادم تھی، اسی طرح گلن صاحب نادانستہ طور عیسائی مدرسی مفکرین یا یونانی فلسفیوں کے خدا کے علم، ارادہ، زمان، ازلیت، ابدیت، کمال مطلق، عدم تغیر اور دیگر تصورات سے شدید طور پر متاثر ہیں، اور انھیں اسلام کے تصورِ حیات سے صریحاً متصادم پاتے ہوئے بھی، بالکل خلافِ عقل دیکھتے ہوئے بھی، احادیث کی بنیاد پر عین اسلام کے مطابق ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔**10** اس اپروچ میں وہ اکیلے نہیں ہیں۔ماضی میں بھی ایسے بہت تھے، حال پر بہت ہیں۔ماضی میں گلن صاحب کے پیشرووں سے ایک مثال پیش کرتا ہوں تا کہ محمد فتح اللہ گلن صاحب کی پوزیشن سمجھنے میں آسانی ہو۔

قرآن پاک کے قدیم یا حادث ہونے کا مسئلہ

اسلام کی بالکل ابتدائی صدیوں میں عیسائیوں سے مباحث کے دوران ارسطو کی مابعد الطبیعات پر مبنی بعض اصطلاحات غیر شعوری طور پر قبول کر لینے سے مسلم علم الکلام میں ذات وصفاتِ باری کے تعلق کا مسئلہ پیدا ہوا۔اشاعرہ اپنے موقف کی بناء پر صفاتیہ، اور معتزلہ، منکرینِ صفات کہلائے۔اسی سے ضمناً 'قرآنِ پاک قدیم ہے یا حادث، غیر مخلوق ہے یا مخلوق' کا مسئلہ پیدا ہوا۔معتزلہ نے قرآنِ پاک کے مخلوق اور حادث ہونے، اور

اشاعرہ نے غیر مخلوق اور قدیم ہونے کا مؤقف اختیار کیا۔ ہماری تحقیق کے مطابق یہ تمام بحث غیر قرآنی فلسفیانہ وجودیات (ontology) اور اسکی اصطلاحات کو قبول کرنے سے پیدا ہوئی تھی۔ اس وقت ہمیں اس کے اس حصے سے تعرض ہے جس کا تعلق مسئلہ تقدیر سے بنتا ہے۔ الفاظ کی صورت میں اظہار سے پہلے ذہن میں پائے جانے والے تصورات کیلئے اشعری نے 'کلام نفسی' (latent speech) اور پیرایہ اظہار کی صورت اختیار کرنے کے بعد 'کلام لفظی' (articulated speech) کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے کہا کہ قرآن پاک 'کلام نفسی' کی صورت میں ہمیشہ سے اللہ کے ساتھ تھا، پھر اسے لوحِ محفوظ پر رکھ دیا گیا، نزول کے بعد اسنے 'کلام لفظی' کی صورت اختیار کی۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ غیر مخلوق ہے اور ازلی ہے۔

قرآن پاک کے مطابق ہر انسان ایسی فطرت پر پیدا ہوتا ہے کہ اس کی پیدائش سے پہلے یا پیدائش کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کا قطعاً فیصلہ نہیں فرما دیا جاتا کہ موت کے وقت وہ حالت کفر میں دنیا سے رخصت ہوگا۔ ایسے افراد جن کے حالت کفر میں دنیا سے رخصت ہونے کا قرآن پاک میں ذکر ہے مثلاً فرعون، ہامان، سامری اور بالخصوص ابولہب اور اسکی بیوی کے بارے میں بھی یہی بات درست ہے۔ کلامِ نفسی اور کلامِ لفظی کی درج بالا تقسیم کو قبول کرنے سے یہ ماننا لازم آئے گا کہ ان کی تذمیم پر مشتمل آیات پہلے کلامِ نفسی کی صورت میں ہمیشہ سے خدا کے ساتھ تھیں، (ذہن میں رہنا چاہئے کہ اللہ کی ہمیشگی ہمارے تمام زمانی تصورات اور حدود سے ماوراء ہے۔) تخلیق کائنات کے بعد انہیں لوح محفوظ پر رکھ دیا گیا۔ نزول کے وقت انہیں کلامِ لفظی کی صورت دے دی گئی۔ یہ عقیدہ ایسی اخلاقی جبریت کو جنم دیتا ہے جو اسلامی عقائد بالخصوص اخلاقی آزادی اور اعمال کی جوابدہی کے یکسر خلاف ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اس تمام بحث، اشاعرہ اور معتزلہ کے مؤقف، اور 'کلام نفسی' اور 'کلام لفظی' کی اصطلاحات کا ماخذ قرآن پاک نہیں، قرآنِ پاک سے متصادم فلسفیانہ نظریات ہیں۔ معتزلہ اور اشاعرہ یہ اصطلاحات قبول کرنے پر اس لئے مجبور ہوئے کیونکہ انھوں نے افلاطون اور ارسطو کے زیر اثر اس بات کو قبول کر لیا تھا کہ وجودیاتی اصول صرف دو ہیں: قدیم (eternal & uncreated)، اور حادث (contingent)۔ لہٰذا قرآن پاک قدیم ہے یا حادث۔ اشاعرہ نے مؤقف اختیار کیا کہ قرآنِ پاک قدیم ہے، معتزلہ نے مؤقف اختیار کیا کہ قرآنِ پاک حادث ہے۔ لَـهُ الخَلْقُ وَ الأَمـرُ ط (القرآن، ۷:۵۴) کے ذریعے قرآن پاک تین اصولوں 'خدا، خلق اور امر' پر مشتمل وجودیات پیش کرتا ہے۔ قرآنِ پاک کی وجودیات کو ماننے کی صورت میں اگر معتزلہ مؤقف اختیار کرتے کہ قرآنِ پاک خلق کی

کیمیگری سے تعلق رکھتا ہے تو اشاعرہ کہہ سکتے تھے کہ یہ امر کی کیمیگری سے تعلق رکھتا ہے۔ اسطرح کلامِ نفسی اور کلامِ لفظی کی غیر قرآنی اصطلاحات کے ذریعے قرآنِ پاک کی ذاتِ باری کے ساتھ عینیت ثابت کرنے کی ضرورت نہ رہتی۔ 11 اسی قسم کے طرزِ فکر کی ایک اور مثال سورہ الصافات کی آیت نمبر ۹۶ کی تشریح ہے۔ انسان کے لئے اخلاقی آزادی ثابت کرنے کیلئے معتزلہ نے مؤقف اختیار کیا کہ انسان اپنے اخلاقی افعال کا خود خالق ہے۔ (یہ قدرتِ مطلق کو محدود کرنے کی قیمت پر انسان کی اخلاقی آزادی کو ثابت کرنے کے مترادف اور بے سند بات ہے۔) یہ اخلاقی فعل میں نتائج کو شامل سمجھتے ہیں، جو کہ اللہ کی مشیت کا انکار ہے۔ ان کے برعکس اشاعرہ فرقے کے بانی ابوالحسن الاشعری نے مؤقف اختیار کیا کہ ہر شے کی طرح انسان کے آزاد اخلاقی عمل کا بھی اللہ ہی خالق ہے۔ انسان اس کا صرف اکتساب کرتا ہے۔ اس دعوے کی دلیل کے طور پر ابوالحسن الاشعری قرآن پاک کی آیت 'وَاللّٰہُ خَلَقَکُمۡ وَمَا تَعۡمَلُوۡنَ۔ (۹۶:۳۷) پیش کرتے ہیں۔ ابوالحسن الاشعری اس آیت کی تشریح اس طرح کرتے ہیں: اللہ نے ہی خلق کیا ہے تم کو اور جو تم بناتے ہو / جو عمل تم کرتے ہو۔ (Allah has created you and what you make/do.) محمد فتح اللہ گلن بھی ابوالحسن الاشعری کے مؤقف کی تائید کرتے ہیں۔ 12 ہمارے فہم کے مطابق یہ نظریہ اخلاقی آزادی کا ایک مجہول (vague) تصور پیش کرتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام مشرکین کے بتوں کو توڑ دیتے ہیں۔ جب مشرکین کو علم ہوتا ہے تو وہ گھبرائے ہوئے آپ کی طرف آتے ہیں۔ آپ انہیں فرماتے ہیں: کیا تم اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوؤں کی عبادت کرتے ہو۔ (95) اور اللہ ہی نے تم کو اور جن چیزوں کو تم کام میں لاتے ہو خلق کیا ہے۔ (37:96) مذکورہ آیت کی جو تشریح ابوالحسن الاشعری نے اختیار کی، درست نہیں کہی جا سکتی۔ قرآن پاک کہیں اسے سپورٹ نہیں کرتا۔ قرآن پاک میں لفظ 'خلق' اور 'عمل' کہیں مترادف نہیں آئے۔ عام فہم بات ہے کہ اللہ بتوں کا خالق نہیں، لیکن اس توفیق کا خالق ضرور ہے جس سے انسان بت بناتے ہیں اور اس مادے کا خالق بھی ہے جسے اس مقصد کیلئے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اسلئے اس آیت کا صحیح ترین ترجمہ Allah has created you and what you make use of. ہی ہوسکتا ہے۔ 13

۳۔ متکلمین کا اللہ کے علمِ مطلق کا تصور اور انسانی آزادی کے حوالے سے اس کے مضمرات

مسئلہ تقدیر کے کئی پہلو ہیں۔ ابتدائی صدیوں میں ہی ان مسائل پر مسلمان قدریہ (Libertarian) اور

جبریہ (Predestinarian) گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔اشاعرہ نے بزعمِ خود ایک درمیانی پوزیشن اختیار کرنے کی کوشش کی۔اللہ کے علمِ مطلق کے حوالے سے اشاعرہ نے موقف اختیار کیا کہ گو اللہ کا علم ازلی ہے، اور ہر شے پر محیط ہے، نا قابلِ خطا بھی ہے، تاہم یہ انسان کے ارادی افعال کو صرف بیان کرتا ہے، متعین نہیں کرتا۔ God's Knowledge is descriptive but not determinative or causative. انسان جو بھی کرتے ہیں، اس میں وہ آزاد ہیں۔**14** آج بھی گلن صاحب، غامدی صاحب، ڈاکٹر ذاکر نائیک اور ان کے ہم خیال یہی نظریہ پیش کر رہے ہیں۔**15** انسانی ڈراموں میں رول ادا کرنے والے کو پتہ ہوتا ہے کہ سکرپٹ رائٹر نے اس کے لئے کیا کردار تخلیق کیا ہے، وہ آزادئ ارادہ کے ساتھ اس رول کو قبول کرتا ہے۔اس رول کو قبول کرنا، نہ کرنا، درمیان میں کہیں چھوڑ دینا اس کے اختیار میں ہوتا ہے۔وہ شعور کے ساتھ اپنے آپ کو اس کردار میں ڈھالتا ہے۔اسے پتا ہوتا ہے ڈرامہ کا انجام کیا ہو گا۔اسے پتہ ہوتا ہے کہ یہ پلے ہے، حقیقت نہیں ہے۔وہ اس میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ڈرامہ ختم ہونے کے بعد، وہ رول اس کی فطرت نہیں بن جاتا۔اس رول کی وجہ سے وہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے شقی یا سعید نہیں ٹھہرا دیا جاتا۔روایات کی بنیاد پر تقدیر کے جس عقیدے کا پرچار کیا جا رہا ہے، اس کے مطابق اللہ نے انسان کو تخلیق کیا اور اس کے ساتھ ہی علمِ الٰہی نے معلوم کر لیا کہ وہ دنیا کی زندگی میں پیدا کئے جانے کے بعد خدا کی عطا کی گئی توفیق کو کیسے استعمال میں لائے گا اور ہمیشہ کیلئے شقی کی حیثیت میں دنیا سے رخصت ہو گا یا سعید کی حیثیت سے۔جس کے بارے میں علمِ الٰہی نے اسکی تخلیق کے ساتھ ہی معلوم کر لیا کہ وہ شقی کی حیثیت میں دنیا سے رخصت ہو گا تو کیا اس کا الزام تخلیق کرنے والے پر نہیں آئے گا! تخلیق کئے جانے کے ساتھ ہی کونسا قصور اس سے ہو گیا کہ علمِ الٰہی میں ازل سے اسے ایسا رول مقدر ہو گیا، اور لوحِ محفوظ پر اس طرح لکھ بھی دیا گیا، کہ وہ اپنے ازل سے معلوم کئے گئے کورس اور نتیجہ کو قطعاً تبدیل کر ہی نہیں سکتا، تو پھر علمِ الٰہی بیانیہ کس طرح ہے اور جبریہ کیوں نہیں! جبر اور کیا ہوتا ہے۔محض اپنے انجام سے لاعلم رکھے جانے سے کیا واقعی آزادئ ارادہ کا ثبوت مل جاتا ہے! درجِ بالا نظریہ، اللہ کو (معاذ اللہ) ایک سکرپٹ رائٹر بنا دیتا ہے۔ابتداء سے انتہا تک ہر چیز اس سکرپٹ میں ازل سے علماً متعین ہو چکی ہے۔سکرپٹ میں ابد تک کبھی بھی کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔اسکا نتیجہ یہ ہے کہ نہ خدا آزاد رہتا ہے اور نہ انسان۔ عیسائیت میں یہ سب حاصل ہے فلسفیانہ اصطلاحات کے ذریعے اللہ کی صفات کا احاطہ کرنے کی کوشش کا۔مسلمانوں میں یہ حاصل ہے روایات کی کتب کو 'الحق' (قرآن پاک) سے بڑا درجہ دینے، 'روایت' کو 'نص' پر حَکم بنانے، اور قرآن کی مابعد الطبیعات سے متناقض فلسفیانہ اصطلاحات اختیار کرنے کا۔

''اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہر شے کا علم رکھتا ہے اور ہمارے ارادے سے متعلق تمام افعال بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاں ازل سے معلوم اور مقدر ہیں، نیز علم الٰہی نا قابلِ خطا ہے۔'' مسلمان روایتی طور پر علمِ الٰہی کے بارے میں یہی عقیدہ رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ عقیدہ عین قرآن پاک کے مطابق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا عقیدہ قرآنی تعلیمات کے قطعاً برعکس ہے۔ قارئین کو یہ جان کر حیرانی ہو گی کہ اللہ کے علمِ مطلق (Omniscience) کا جو نظریہ اوپر بیان کیا گیا ہے، اس میں اور سینٹ تھامس اکوائنس (۱۲۲۵۔۱۲۷۴) کے تشکیل دئے گئے Omniceience کے نظریئے میں کوئی فرق نہیں۔ یہ اسی نظریے کا جو عیسائیت میں Traditional Doctrine of Omniscience کے نام سے مشہور ہے، آسان الفاظ میں بیان ہے۔ مسلمانوں میں اشاعرہ اور ماتریدیہ نے بھی اپنے اپنے انداز میں علمِ الٰہی کو ازلی قرار دیا۔ الفارابی اور ابنِ سینا نے علمِ الٰہی کو اسطرح ازلی قرار دیا کہ اللہ تعالیٰ کیلئے حال پر علمِ جزئیات کی گنجائش ہی نہیں بچتی۔ قرآنِ پاک میں اللہ کے علمِ مطلق کے کسی ایسے عقیدے کیلئے قطعاً کوئی گنجائش موجود نہیں۔ 16

مسئلہ تقدیر کے چند دیگر پہلو

افعال دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک وہ جو انسان کے ساتھ وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ دوسرے جو وہ سرانجام دیتا ہے۔ جو انسان کے ساتھ وقوع پذیر ہوتے ہیں ان کے بارے میں یہ یقین رکھنا کہ وہ اللہ کی مشیت کے تابع ہیں ایمان کا حصہ ہے۔ جبکہ وہ افعال جو انسان سرانجام دیتا ہے، اس کی نیت میں وہ آزاد ہوتا ہے، خدا کی دی گئی توفیق کے استعمال کا رخ اختیار کرنے میں وہ آزاد ہے۔ نتیجہ اللہ کی قدرت کے تابع ہوتا ہے اور اسی کا نام مشیت ہے۔ یہ قطعاً لازم نہیں کہ اس کی مشیت پہلے سے طے ہو۔ وہ حال پر جو چاہے کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ ارشادِ باری ہے: يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ط كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَاْنٍ۔ اسی سے سوال کرتے ہیں جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ اس کی جلوہ گری ہر روز نئی شان میں ہوتی ہے۔ (سورہ الرحمٰن، ۲۹:۵۵) خلق کی طرف سے اپنی احتیاج کے حوالے سے سوال کا ہونا ضروری ہے۔ خالقِ کل ہی ہر احتیاج کو پورا کرنے کی شان کا مالک ہے۔۔۔ تخلیق کے بعد اس کا کام ختم نہیں ہو گیا۔ عبد کو اپنے معبود کے عرفان کیلئے حال پر جو کچھ درکار ہوتا ہے، معبود کی جلوہ گری اسی شان میں ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو تو اتمامِ حجت ہو ہی نہیں سکتا، اور اتمامِ حجّت اللہ کی سنّت ہے۔ (تفسیر فاضلی منزل ہفتم، ص ۱۶۴) اللہ کا امر آسمانوں میں نازل ہوتا ہے، تا کہ تمھیں علم ہو جائے کہ اللہ ہر شئے پر قادر ہے۔ (سورہ الطّلاق، ۱۲:۶۵) اللہ ہی آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ ٹل نہ جائیں۔ (سورہ فاطر، ۴۱:۳۵) قرآن پاک ایک منظّم اور ایڈمنسٹرڈ کائنات کا تصور

دیتا ہے۔ایک مکانکی کائنات کا تصور نہیں دیتا۔قوانینِ فطرت اللہ کی قدرت کے تابع ہیں،اللہ کی قدرت ان کے تابع نہیں۔وہ حال پر اپنی تخلیق میں اضافہ کرنے پر قادر ہے جو چاہے۔17 خلق الموت والحیات لیبلوکم ایّکم احسن عمل۔ اس نے موت اور حیات کو خلق کیا ہے،یہ دیکھنے کیلئے کہ تم میں اچھے عمل کون کرتا ہے۔(القرآن، ۶۷:۱۔۲) کیا یہ نظریہ کہ شقی ہونا یا سعید ہونا دارالعمل میں آنے اور حیات دنیا کی مہلت ملنے سے پہلے طے پا چکا ہے' قرآن پاک کی اس آیت سے متصادم نہیں! موت کو تخلیق کرنے والا،موت کو مؤخر بھی کرسکتا ہے اور حیات کو تخلیق کرنے والا مہلتِ حیات کو کم یا زیادہ بھی کرسکتا ہے۔لیکن یہ بات طے ہے کہ: کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت ۔ ہر نفس کو موت آئے گی۔(۳:۱۸۵؛۲۱:۳۵) پیدائش سے موت تک اللہ نے ہر ایک کیلئے عمل کی ایک مہلت (respite) مقدر کر رکھی ہے۔اسی کو قرآنِ پاک میں اجلِ مسمّٰی (appointed term) کہا گیا ہے۔اللہ نے فرمایا یہ ہے کہ: اللہ سے استغفار کرو،اور اسکی طرف رجوع لاؤ؛وہ تمھیں اجلِ مسمّٰی تک احسن رزق عطا کرے گا۔(۱۱:۳) اسی طرح فرمایا ہے:اللہ تمھیں بلاتا ہے کہ تمھارے گناہ معاف کرے،اور تمھیں اجلِ مسمّٰی تک مہلت دے۔(۱۴:۱۰) صرف ان لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے جنھیں موت کے وقت احساس ہوتا ہے کہ جن حقائق کا انکار کرتے ہوئے انھوں نے زندگی گزار دی ،وہ تو حقیقت ہیں،اس وقت وہ التجا کرتے ہیں:یا اللہ ہمیں مہلت عطا کرتا کہ ہم صالح اعمال کریں۔ اس وقت انھیں کہا جاتا ہے کہ اجلِ مسمّٰی (appointed term) پوری ہو چکی،صداقت کا ثبوت دینے کیلئے مہلت ختم ہو چکی،اب ایک لمحہ کی تقدیم یا تاخیر نہیں ہوسکتی۔تمام لوگوں کے بارے میں اجلِ مسمّٰی اٹل (inexorable) نہیں ہوتی۔(۱۶:۶۱) اللہ زندگی بڑھاتا بھی ہے جس کیلئے چاہے،کم بھی کرتا ہے جس کے لئے چاہے۔رزق مقدر ہے کا مفہوم یہی ہے کہ: کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمّہ نہ ہو۔ (11:6) اللہ ہر ایک کو پالتا ہے اور علم سے پالتا ہے: وہ رزق قبض کر دیتا ہے جس کا چاہتا ہے،اور بسط کر دیتا ہے جس کا چاہتا ہے،اور جسے چاہے بے حساب رزق دے۔(القرآن،۱۳:۲۶؛ ۱۷: ۳۰؛ ۲۸: ۸۲؛ ۲۹:۶۲؛ ۳۰:۳۷؛ ۳۴:۳۶۔۳۹؛ ۳۹:۵۲؛ ۴۲:۲۱) اگر مقدارِ رزق ازل سے طے ہے اور لوحِ محفوظ پر لکھ دی گئی ہے تو پھر رزق قبض کر دینا،بسط کر دینا،یا بے حساب دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جہاں تک رزق کو کسب کرنے کا تعلق ہے ''اللہ کا فضل تلاش کرنے کا حکم ہے۔''(۲:۱۹۸؛ ۶۲:۱۰۔۱۱) وہی پاک رزق اللہ کا فضل ہے جو اللہ کی مقرر کردہ حدود کا احترام کرتے ہوئے عطا ہو،جو رزق اللہ کی مقرر کردہ حدود کی خلاف ورزی کرتے ہوئے حاصل ہو وہ اللہ کا فضل نہیں ہے،پاک نہیں ہے،اللہ کا دیا ہوا نہیں ہے،ملتا وہ بھی اللہ کی مشیت سے ہے،رضا اور مشیت کا

فرق ہم واضح کر چکے ہیں۔

تقدیر اور تدبیر

تدبیر کرنا حق ہے اور تدبیر کا منشا کبھی اللہ کی مشیت کو بدلنا نہیں ہوتا۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان پر تدبیر کرنے کا حق عائد کیا گیا ہے،اسی لئے اللہ کی رضا کو انسان پر واضح کیا گیا ہے۔تدبیر یہی ہے کہ حق کی احسن ادائیگی کیلئے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ توفیق کی اس طرح حفاظت کی جائے، کہ وہ رضائے الٰہی کے مطابق صحیح محل پر استعمال ہو۔جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی کو ساتھ لیکر مصر روانہ ہوتے ہیں، اور وہ ایک گروہ تھے،تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو نصیحت فرمائی کہ ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا، بلکہ کئی دروازوں سے داخل ہونا۔منشا یہ تھا کہ ان لوگوں کا شہر میں داخل ہونا،بڑی خبر نہ بنے اور اس خبر کا جو منفی ردِعمل ہوسکتا ہے،اس سے یہ لوگ بچ جائیں۔اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں فرمایا ہے: 'اور بے شک وہ ضرور علم والے تھے جو علم ہم نے انھیں عطا کیا۔'(سورہ یوسف، ۱۲:۶۸) حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنے بچوں کی سلامتی کی طلب تھی۔لیکن اللہ کی مشیت کو روکا نہیں جا سکتا تھا۔اسی لئے آپ نے پہلے ہی یہ فرمادیا تھا:اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ(۱۲:۶۷) رضائے الٰہی کے خلاف کرنے والے خواہشات کی پیروی کے حوالے سے جو کچھ کرتے ہیں اسے قرآن پاک میں مکر کہا گیا ہے۔'مکر' کا لفظ مثبت معانی بھی استعمال ہوا ہے،فرمان الٰہی ہے: وَاللّٰہُ خَیۡرُ الۡمٰکِرِیۡنَ ؕ(سورہ آل عمران،۳:۵۴؛ سورہ الانفال، ۸:۳۰) اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائی کو اپنے پاس روک لینا چاہتے تھے،لیکن ملکی قانون کے مطابق وہ ایسا کرنے کا حق نہیں رکھتے تھے۔آپ نے اللہ کی سکھائی ہوئی تدبیر سے یہ کیا کہ بھائیوں سے ان کے دستور کو بیان کروایا اور اسی دستور کے مطابق جس سے پیالہ برآمد ہوا اسے خدمت کے لئے روک لیا۔ تدبیر علمی برتری کو ثابت کرتی ہے۔اللہ جسے چاہے علمی برتری عطا کرتا ہے۔(ماخوذ،تفسیرِ فاضلی منزل چہارم،تفسیر سورہ یوسف،آیات ۶۷ اور ۷۶) صاف ظاہر ہے کہ تدبیر کا کوئی تضاد انسان کی آزادیٔ ارادہ کے ساتھ نہیں۔

قضا اور قدر

'قضا' کا تعلق تخلیق سے بھی ہے۔اللہ تعالیٰ جب کسی شے کو تخلیق کرنے کا ارادہ فرمالے،اسکے لئے امر فرماتا ہے،اسکے ارکان فوراً حاضر ہو جاتے ہیں،جبھی وہ ہو جاتی ہے۔(البقرہ،۲:۱۱۷) جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی امر کا عنوان رکھ دیا جاتا ہے،تو ارکان جمع ہونے لگتے ہیں اور صورت بننے لگتی ہے۔(آل عمران،

۴۷:۳) ارشاد ہے: ''وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، (ثُمَّ قَضَىٰٓ اَجَلًا ط) پھر اجل مقرر کی۔اور اس کے نزدیک اجل مسمّٰی ہے، پھر بھی تم شک کرتے ہو۔'' (سورہ الانعام، ۲:۶) اللہ نے ہمیں مٹی سے پیدا کیا ہے۔پھر اس نے ہر زندگی کی ایک حد مقرر کی ہے، یہ اجل ہے۔اور عمل کے لئے دئے گئے وقت کا کلّی خاتمہ اجل مسمّٰی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے پاس ہر شے کے خزانے ہیں۔ان خزانوں کی پیدائش اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ہر شے کو اس مقدار میں لوگوں کے سامنے لانا کہ وہ نظام کائنات کے اعتدال پر رکھنے میں ممد ہو، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسکا قدرِ معلوم کے ساتھ نزول ہے۔'قدر' کا مفہوم مشیت بھی ہوتا ہے۔''کئی سال مدین میں رہنے کے بعد تقدیر سے آپ یہاں آئے اے موسیٰ علیہ السلام۔(سورہ طٰہٰ، ۴۰:۲۰) وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا ط ''اللہ کا امر ٹھیک اور پورا ہوتا ہے۔(الاحزاب، ۳۸:۳۳) اللہ کا امر بالکل موزوں وقت پر اور بالکل موزوں طریقے سے ہوتا ہے، کیونکہ علیم مطلق کا امر ہوتا ہے۔ارشاد ہے: ''اگر وہ اپنے تمام بندوں کے رزق میں بسط فرما دیتا ضرور زمین میں بغاوت کرتے، (وَ لٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ) ولیکن وہ جس قدر چاہے نازل کرتا ہے۔بے شک وہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا، دیکھنے والا ہے۔(الشُّوریٰ، ۲۷:۴۲) اللہ تعالیٰ جس قدر چاہے دیتا ہے، اس کا دینا بڑے علم سے ہوتا ہے۔بسط بھی اس کے علم سے ہوتی ہے، قبض بھی اس کے علم سے ہوتی ہے۔قرآن پاک کی سند سے ثابت ہے کہ 'قضا و قدر' کا کوئی تعلق انسان کی آزادیٔ ارادہ سے نہیں، نہ یہ اس کی آزادیٔ ارادہ کو متاثر کرتے ہیں۔ان کا تعلق اللہ کی مشیت سے ہے اور اس کی مشیت اس کے علم سے ہوتی ہے۔

_ حاصل بحث

مسئلہ تقدیر پر مفسرین، متکلمین، اور فلاسفہ کے نظریات سے واضح ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر کے ہاں اللہ کے علم مطلق، اللہ کی رضا، اللہ کی مشیت، انسان کی آزادیٔ ارادہ، توفیق، تصورِ زمان، لوحِ محفوظ، الحق ہونے کے حوالے سے قرآن پاک کی حیثیت اور روایات پر مشتمل کتب کی حیثیت میں ابہام پایا جاتا ہے، جسے دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔انسان نیت کرنے میں آزاد ہے، عطا کی گئی توفیق کے استعمال کا رُخ اختیار کرنے میں آزاد ہے۔توفیق کے استعمال سے ہی رُخ کا تعین ہوتا ہے۔نتائج اللہ کی مشیت کے تابع ہوتے ہیں۔نتائج کو باذن اللہ ماننا ایمان کا رکن ہے۔یہی تقدیر پر ایمان ہے۔انسان توفیق کے استعمال کیلئے اللہ کی بارگاہ میں مسئول ہے۔لوحِ محفوظ پر صرف ہدایت اور گمراہی کو متعین کرنے والے اصول درج ہیں، جن کے مطابق انسان کے رُخ کے درست یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔انسانوں کے اعمال اور شقی ہونے کا علمِ الٰہی میں تعین انسان

کوتوفیق دیکر دارالعمل میں بھیجے جانے کے بعد ہوتا ہے۔منکرینِ حق اور انکے معبود جن ملکر بھی کسی کو بہکانے کی استطاعت نہیں رکھتے (سوائے اسکے جو بہکنے کیلئے تیار ہو،) یہی لوگ ہیں جو بھڑکتی آگ میں جانے والے ہیں، جیسے کہ ان آیاتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے: مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفَاتِنِيْنَ؛ اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ۔(الصّٰفّٰت،۳۷: ۱۶۲۔۶۳) انسان کا نصیب پہلے سے لکھا ہوا نہیں ہوتا، عمل کے بعد لکھا جاتا ہے۔'ازلی علم' یا 'قدیم علم' کی اصطلاحات غیر قرآنی ہیں اور عملاً اللہ تعالیٰ کی صفتِ ارادہ، اور اسکے علمِ جزئیات کے انکار پر منتج ہوتی ہیں۔یہی اصطلاحات انسان کی آزادیٔ ارادہ و اختیار کے انکار کیلئے بنیاد فراہم کرتی ہیں۔اللہ 'الدھر' نہیں ہے، نہ ہی 'الدھر' اللہ ہے۔خدا کو ازلی یا قدیم (eternal) کہنا اسے زمانی ہستی (temporal being) بنا دیتا ہے، جو اس کی شان کے منافی ہے۔زمانِ الٰہی کو ابدی حال (eternal now) کہنا بھی اس کی شان کے منافی ہے۔اللہ زمان و مکان کے انسانی تصورات سے ماوراء ہے۔زمان و مکان سے اللہ کی ماورائیت یا timelessness پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھے ہوئے شخص کی مانند نہیں۔وہ علیمِ مطلق (Omniscient) ہے، زمین کی گہرائیوں یا آسمان کی پہنائیوں میں ایک ذرہ بھی اس کے علم سے باہر نہیں۔ وہ قادرِ مطلق (Omnipotent) ہے؛ تمام نتائج اسکی مشیت کے تابع ہے۔ماسواء اللہ اسکی 'تخلیق' ہے یا اسکا 'امر'۔'خلق' اور 'امر' دونوں اسکی قدرت کے تابع ہیں۔ان میں سے کوئی اسکی الوہیت میں شریک نہیں۔اسکا علم 'خلق' اور 'امر' دونوں پر محیط ہے۔صاحب ارادہ ہونا اس کی شان ہے۔وہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ط ہے۔حال پر کسی شے کا ارادہ کرنے سے اسکی شان میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔وہ تغیر یا عدم تغیر کے انسانی تصورات سے ماوراء ہے۔صورت کی حقیقت تعین ہے۔تمام صورتوں کے خالق کی حیثیت سے خدا کی ماورائیت، اسکا تعینات سے ماوراء ہونا ہے۔اللہ کی رضا اور اللہ کی مشیت میں فرق ہے۔رضا، معلوم اور متعین ہوتی ہے۔مشیت کیلئے ایسا ہونا ضروری نہیں۔مغربی مفکرین صدیوں سے اسلام پر جبریت پسندی (predestinarianism) کا الزام لگاتے چلے آرہے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ اسلام میں قدریہ نظریات (libertarianism) عیسائی مفکرین ہی کی خوشہ چینی کا حاصل ہیں۔یہ اسلام کے اپنے نظریات نہیں ہیں۔مسلم مفکرین قرآنِ پاک کی تعلیمات کو پسِ پشت ڈال کر، خلافِ قرآن فلسفیانہ اصطلاحات استعمال کرکے، اور روایات کو قرآنِ پاک پر حَکم بنا کر ان کے ان الزامات کو بنیاد فراہم کر رہے ہیں۔ذاتی تقویٰ اور خلوصِ نیت اپنی جگہ، اسلام کے حوالے سے بات وہی درست ہے جس کی قرآنِ پاک سے تصدیق ہو۔حال پر صرف قرآنِ پاک ہی سند کا درجہ رکھتا ہے۔کسی بھی نظریہ، اصول، عقیدہ، روایت، ارشاد، قول، گمان، خیال، احساس، وہم، قیاس، تصور، تخیّل، تأثر، وجدان، واردات،

حال، کشف، شہود، تشریح، تعبیر کی صداقت کا حتمی معیار قرآنِ پاک ہی ہے۔ 'الحق' ہونے کا درجہ صرف قرآنِ پاک کا ہے۔ اللہ کے نازل فرمائے ہوئے کے مطابق حکم نہ کرنا کفر ہے۔ اللہ کے نازل فرمائے ہوئے کے مطابق حکم نہ کرنا ظلم ہے۔ اللہ کے نازل فرمائے ہوئے کے مطابق حکم نہ کرنا فسق ہے۔ ارشادِ باری ہے: وَ مَنۡ اَصۡدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیۡثًا ط اللہ سے اصدق حدیث کس کی۔ (النساء۴:۸۷) حدیثِ اصدق کے مقابل حدیث سچی نہیں ہوسکتی۔

ا۔ قرآنِ پاک کے معیارِ حق ہونے کے حوالے سے دیکھئے مصنف کا تحقیقی مضمون:

1. Is 'al-Haqq' one of al-Asma' al-Husna!, Bazyaft: A Research Journal, vol. 9 (2006), pp.1-31, Department of Urdu, University of the Punjab, Lahore. ہماری تحقیق کے مطابق متنِ قرآن چھ ہزار دوسو اڑتیس (۶۲۳۸) آیات پر مشتمل ہے۔ (چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ (۶۶۶۶) آیات پر مشتمل سمجھا جانا بالکل غلط ہے۔) حوالے کیلئے دیکھئے ہمارا مضمون Abdul Hafeez Fazli, Number of Verses of the Quran (Index and Argument), IJHSS, Vol. 2 No. 19, October 2012, pp.264-67, USA.

2. محمد فتح اللہ گلن، تقدیر: کتاب و سنّت کی روشنی میں، مترجم محمد خالد سیف، نظر ثانی شازیہ یعقوب، اسلام آباد : ہارمنی پبلیکیشنز، ۲۰۰۹

3. تفصیل کیلئے دیکھئے ہمارا مضمون، عبدالحفیظ، تخلیق، صدور اور ہم ازلیت، اقبالیات: اقبال اکیڈمی لاہور، جنوری۔جولائی ۱۹۸۸ء، ص ۱۸۱۔۱۹۹ اور Abdul Hafeez Fazli,IBN SINA, AL-GAZALI AND IBN TAYMIYYAH ON THE ORIGINATION OF THE WORLD,International Journal of Humanities and Religion (IJHR), 2(1), February, 2013, 19-30.

4. حوالہ کیلئے دیکھئے، القرآن، ۳:۳۹، ۳:۴۵۔۵۱، ۱۱۔۷۱

5. Javed Ahmed's Videos at http://tune.pk/video/3594054/kismat-taqdeer-aur-insan-ka-ikhtiyar-javed-ahmed-ghamidi

6. For detailed study see, Abdul Hafeez, "Free Will and

Predestinarian Verses in the Quran", Hamdard Islamicus, 1999, 4, pp. 97-105.

7. For detailed study see, Abdul Hafeez, Knowledge of Allah's Pleasure (*Rada*) and Knowledge of Allah's Will (*Mashiyat*), IJHSS, Vol. 2 No. 19 [Special Issue October 2012], pp.298-300, USA

8. G.F. Hourani, "The dialogue between Al-Ghazali and the philosophers on the origin of the world", part-I, the Muslim World, vol.48 Issue 4(1958), p.184-85.

9. عبدالحفیظ فاضلی، کیااللہ الدھر ہے! ، الحکمت،شعبہ فلسفہ جامعہ پنجاب لاہور،جلد۲۹، ۲۰۰۹،ص۱۔۱۶

10. For details see, Abdul Hafeez Fazli, "Christian Theologians and Philosophers' View of Omniscience and Human Freedom", Iqbal Review, Lahore: Iqbal Academy Pakistan, vol.47 no. 4, October 2006, p. 33-68. also see, Richard Swinburne, *The Coherence of Theism,* Oxford, Clarendon Press, 1977, p. 217.

11. For details please see: Abdul Hafeez, "*Quran: Khalq ya Amr*, (Urdu), Talimi Zawiyay, January 2003, Islamabad.اورAbdul Hafeez Fazli, Quran: Creation or Command, International Journal of Humanities and Religion [IJHR], 2(10) December 2012: 75 -83, India.

12. محمد فتح اللہ گلن، تقدیر۔۔۔، ص۱۰۶

13. For details see, Abdul Hafeez Fazli, "Qudrat e Mutliq our Insaani Aazadi",(Urdu), al-Hikmat, Vol. 20 (2000), The Department of Philosophy, University of the Punjab Lahore Pakistan.

14. For details see, Abdul Hafeez Fazli, "Quranic View of

Omniscience and Human Freedom", Al-Hikmat, Vol. 26 (2006), The Department of Philosophy, University of the Punjab Lahore.

15. جاوید احمد غامدی کا نظریہ ہے کہ انسان کی آزادی و اختیار کا تعلق اس کے صرف اخلاقی وجود کے دائرے سے ہے۔قیامت کے دن وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اسی بات کے لئے مسئول ٹھہرایا جائے گا۔تقدیر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ کیلئے ایک بات طے کر دی گئی ہے۔انسان کے طبعی وجود سے متعلق چیزیں اسکے لئے مقدر ہیں کہ ان کا فیصلہ ہمارے پیدا کرنے والے نے ازخود کر دیا ہوا ہے۔یہ ساری چیزیں اللہ کے ہاں پہلے سے لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ہمارے اخلاقی وجود سے متعلق چیزیں خدا کے علم میں ہیں۔علم کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو دونوں راستے بتا دئے گئے ہیں۔آپ کونسا راستہ اختیار کریں گے یہ خدا نے پہلے سے جان لیا ہے۔آپ کی آزادی واختیار سے متعلق وہ چیزیں جو علم الٰہی نے پہلے سے جان لی ہیں وہ بھی لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔جس دائرے میں آپ کو اختیار حاصل ہے اس میں خدا نے لکھا ہی یہ ہے کہ آپ اپنے آزاد ارادے اور اختیار سے یہ یہ کام کریں گے۔

مثلاً میں نے دوڑ میں حصہ لیا، تیاری کی، ایک آدمی جو مجھے پہلے سے جانتا تھا اسے علم تھا کہ میری کیا پرا گریس ہو گی۔میرا نتیجہ اس کے علم کی وجہ سے نہیں تھا، میری کارکردگی کی بنا پر تھا۔انسان کو اللہ نے صالح فطرت پر پیدا کیا ہے۔انسان **نیکی اور بدی کا شعور لیکر آیا ہے، نیک یا بد بن کر نہیں پیدا ہوا**۔خدا کا ازلی علم، محیطِ کل علم ہے۔اس کا کوئی ازل اور ابد نہیں ہے۔اس میں کوئی ماضی، حال اور مستقبل نہیں ہے۔اس کا علم اسکی قدرت پر موثر ہے یا اس کی قدرت اس کے علم پر موثر ہے، اس کے بارے میں ہمیں قلیل علم دیا گیا ہے۔اس کیلئے آخرت میں ہی پتہ چلے گا۔

http://tune.pk/video/3594054/kismat-taqdeer-aur-insan-ka-ikhtiyar-javed-ahmed-ghamidi;

http://www.haniyas.com.pk/watch?v=i8PdQDTAgng

http://www.youtubes.pk/watch/7XiOaatEJ4o/22-qismat-aur-taqdeer-kia-hoti-hai-maslah-jabar-o-qadar-javed-ahmed-ghamidi.html)

ڈاکٹر ذاکر نائیک کا نظریہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ غیب کا علم رکھتا ہے اس لئے اسے مستقبل کا بھی علم ہے۔وہ پہلے سے جانتا ہے کہ کوئی شخص پیدا ہونے کے بعد کیا افعال سرانجام دے گا۔یہی بات وہ لکھ دیتا ہے، اسی کو تقدیر کہتے ہیں۔بقول ڈاکٹر ذاکر نائیک، قرآن پاک میں کہا گیا ہے کہ جیسے ہی بچہ پیدا ہوتا ہے، تقدیر اس کے گلے سے لٹکا دی جاتی ہے اور اللہ اسکی تقدیر لکھ دیتا ہے۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ علمِ الٰہی فرد کے افعال کو متعین کرنے کا باعث

بنتا ہے بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔آپ ایک راستے کا انتخاب کرتے ہیں اس لئے نہیں کہ اللہ نے ایسا لکھ دیا ہوا ہے بلکہ اس لئے کہ اللہ کو علم غیب ہے اور پہلے سے جانتا ہے کہ آپ یہ کریں گے۔اللہ نے ہمیں آزادئ ارادہ سے نوازا ہے اور وہ اس میں مداخلت نہیں کرتا۔آپ اپنی آزادئ ارادہ سے وہی کام کرتے ہیں جو اس نے پہلے سے لکھ رکھا ہوتا ہے۔ذاکر نائیک مثال یہ دیتے ہیں کہ استاد اگر یہ کہتا ہے کہ فلاں سٹوڈنٹ فرسٹ آئے گا، فلاں سیکنڈ آئے گا، اور فلاں پاس نہیں ہو سکے گا اور ایسا ہی ہوتا ہے تو اسکا مطلب یہ نہیں کہ استاد کے علم نے اس بات کو متعین کر دیا تھا، بلکہ یہ رزلٹ طالب علموں کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔لیکن یہ مثال درست نہیں۔استاد کا علم اندازے قیافے کا علم ہے، اللہ کا علم نا قابل خطا ہے۔طالبعلم اپنی محنت سے اپنا مقدر بدل سکتا ہے، جب کہ دوسری صورت میں یہ ممکن نہیں۔اللہ تخلیق کرتا ہے اور ساتھ ہی یعنی توفیق عطا کرنے سے پہلے جان بھی لیتا ہے کہ اسکا مقدر کیا ہے تو پھر آزادئ ارادہ کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے، اگر اسکا مقدر برا ہے تو اس کے لئے ذمہ دار کون ہے!

2.48 minutes video at

"http://tune.pk/video/2949811/dr-zakir-naik-islamic-definition-of-destiny-taqdeerfate

تفہیم القرآن میں سورہ البروج (۸۵) آیت (۲۲) اور سورہ الزخرف آیت (۴) کے ضمن میں مودودی صاحب لوحِ محفوظ کے ایسے تصور سے اتفاق نہیں کرتے جس کے مطابق یہ ایک کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور جس پر ازل سے ہی تمام بنی آدم کی تقدیر اور دنیا کی زندگی میں کئے جانے والے ارادی اخلاقی اعمال تحریر کر دیئے گئے ہوں۔اور کہتے ہیں کہ خدا نے انسان کی فطرت میں برائی اور بھلائی، دونوں کی تمیز ودیعت کر دی ہے۔ (تفہیم القرآن، تفسیر سورہ الشمس:۸) اور نیکی اور برائی، دونوں کے رستے بتا دیئے ہیں۔(تفہیم القرآن، تفسیر سورہ البلد:۱۰) پھر اسے اختیار دے دیا ہے کہ جو راستہ چاہے اختیار کرے۔تفہیم القرآن، تفسیر سورہ الدھر:۲۹) لیکن اس کے ساتھ ہی سورہ الحدید کی آیت نمبر ۲۲ ''جو مصیبت بھی زمین میں آتی ہے یا خود تم پر نازل ہوتی ہے، وہ پیش آنے سے پہلے ہی کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔'' کی تفسیر کے ضمن میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ کتاب سے مراد ہے نوشتۂ تحریر اور اپنی مخلوقات میں سے ایک ایک کی تقدیر پہلے سے لکھ دینا اللہ کے لئے کوئی مشکل کام نہیں۔(تفہیم القرآن، تفسیر سورہ الحدید:۲۲) اس کا مطلب یہ ہوا وہ یہ بھی مان رہے ہیں کی ایک ایک فرد کی تقدیر پہلے سے لکھی ہوئی ہے۔مودودی صاحب کے ہاں مسئلہ تقدیر پر اظہار خیال کرنے والے اکثر علمائے کرام کی طرح اللہ کی رضا اور مشیت کے تصورات اور ان میں فرق بھی واضح نہیں۔(مسئلہ جبر وقدر، ص ۷۵، اور ص

۱۰۰) اپنی کتاب مسئلہ جبر وقدر، ص ۱۱۱ پر یہ بھی کہتے ہیں کہ ''وہ مابعد الطبیعی مسائل جن میں فلاسفہ اور متکلمین الجھے ہوئے ہیں یعنی اللہ کے علم اور اسکی معلومات، اسکی قدرت اور اس کے مقدرات، اسکا ارادہ اور اسکے مرادات میں کس نوع کا تعلق ہے، اور اسکے ارادۂ سابق، ارادۂ ازلی، اور قدرتِ مطلقہ کے ہوتے ہوئے انسان کس طرح با اختیار اور اپنے ارادے میں آزاد ہوسکتا ہے، تو ان مسائل سے قرآن نے کوئی بحث نہیں کی کہ انسان ان کو سمجھ نہیں سکتا۔'' قرآن پاک کی آیات قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْن۔ وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْن۔ (الصّٰفّٰت، ۳۷: ۹۵۔۹۶) کا ترجمہ ابوالحسن الاشعری اور انکے متبعین کی طرح مودودی صاحب بھی اس طرح کرتے ہیں جس سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ وہ بھی اللہ ہی کو انسان اور اسکے اخلاقی اعمال دونوں کا خالق سمجھتے ہیں۔ (تفہیم القرآن، تفسیر سورہ الصّٰفّٰت، ۹۵: ۹۶)

مسئلہ جبر وقدر، سید ابوالاعلیٰ مودودی، لاہور: اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، ایڈیشن ۲۰۰۰۔

۱۔ سورہ الاعراف کی آیت کریمہ الست بربکم (۷: ۱۷۳) کے حوالے سے تفسیرِ فاضلی کا نقطۂ نظر یہ ہے، کہ حضرت آدم علیہ السلام سے بنی آدم اور بنی آدم سے ان کی ذرّیّت جلوت میں ظہور پذیر ہونے سے پہلے خلوت کے مقام پر تھی۔ اس مقام پر بنی آدم کے ہر ہر فرد نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیّت کبریٰ کو شعور کے ساتھ تسلیم کیا اور عمل کیلئے دی گئی توفیق سے پہلے کیا۔

اس تسلیم کے مطابق ہر نفس پر یہ حق عائد ہوتا ہے کہ وہ جس طرح اس دنیا میں پاک پیدا ہوا تھا، حدودِ خداوندی کا احترام کرتے ہوئے اسی طرح پاک رہتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو۔

جو رخ کوئی اختیار کرتا ہے، اپنے شعور کے ساتھ کرتا ہے۔ جو رُخ اختیار کیا جائے گا اسی کی جزا دی جائے گی۔

گمراہی ہمیشہ اپنی خواہشات کی پیروی سے ہوتی ہے اور یہ ہر نفس کا ذاتی فعل ہے۔ کسی دوسرے کا فعل کسی نفس کو گمراہ نہیں کرتا۔

ہر نفس کو اس کے عمل کی جزا دی جائے گی۔

(تفسیرِ فاضلی، منزل دوم، فاضلی فاؤنڈیشن لاہور، بار دوم ۱۹۹۸ء، ص ۲۹۹۔۳۰۱)

۲۔ سورہ ھود آیت، ۱۰۵ یومَ یاتِ لا تکلمُ نفسٌ الّا باذنہٖ ج فمنھم شقیٌّ وَّ سعیدٌ ط اور دیگر آیات جب وہ دن آئے گا، کوئی اس کے اذن کے بغیر بات نہیں کرے گا۔ تو ان میں کوئی بد بخت [شقی] ہے کوئی نیک بخت [سعید] ہے۔ (۱۱: ۱۰۵) اور جتنے

لوگ ہیں، تمھارا رب انھیں ان کے اعمال پورے دے گا۔بیشك اسے خبر ہے،جو عمل وہ کررہے ہیں۔(۱۱: ۱۱۱)تو سیدھے رھو جیسے تمھیں امر ہے،---اور سر کشی نہ کرو۔بے شك وہ دیکھ رہا ہے جو عمل تم کرتے ہو۔(۱۱: ۱۱۲)---نیکیاں،برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔یہ نصیحت ہے ذکر کرنے والوں کیلئے۔(۱۱: ۱۱۴) کے حوالے سے تفسیرِ فاضلی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ:

شقی وہ ہے جو فلاح سے دور ہے،سعید وہ ہے جو فلاح پائے۔

نیک بختی یا بدبختی انسان کے اعمال سے تعلق رکھتی ہے۔

عمل کیلئے دی گئی توفیق کو استعمال کرنے میں جو رُخ اختیار کیا جائے،وہی اس کا بخت ہوگا۔

رُخ اختیار کرنے کی آزادی انسان کو دی گئی ہے،اس کی جزا بھی دی جائے گی۔

خسارے میں پڑے تو اس کی بدبختی اس کے کیے کی بدولت ہوگی،فلاح پائے تو اس کی نیک بختی اس کے کیے کی بدولت ہوگی۔

ہمارے ہر عمل میں مقصد اللہ کی رضا ہو،حصول مقصد کیلئے جو سعی کی جائے وہ اسوۂ رسول ﷺ کے مطابق ہو،اور پھر نتائج کو باذن اللہ مان کر اپنا توازن ٹھیک رکھا جائے تو سب مقامات پر سلامتی قائم رہتی ہے۔

(ماخوذ،تفسیرِ فاضلی،منزل سوم،فاضلی فاؤنڈیشن لاہور،باردوم ۲۰۱۰،ص ۱۰۵، ۱۰۸_۱۰۹)

۳۔ سورہ یٰسین کی آیت ''بے شك ہم مُردوں کو حیات دیں گے اور لکھ رہے ہیں جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا اور جو نشان پیچھے چھوڑ گئے۔اور ہر شئے ہم نے لکھ رکھی ہے ایك بتانے والی کتاب میں۔(۳۶:۱۲) کے ضمن میں تفسیرِ فاضلی کا نقطۂ نظر ہے کہ:

بعث بعد الموت یقیناً ہوگی اور بندوں کو ان کے کیے کی جزا دی جائے گی۔

اعمال پہلے سے لکھے ہوئے نہیں ہیں،حال پر لکھے جا رہے ہیں۔

ان کے دو حصے ہوتے ہیں:ایک حصہ وہ ہوتا ہے جس میں توفیقِ ایزدی سے ایک راستہ اختیار کیا جاتا ہے اور شعور کے ساتھ مقاصد کے حصول کیلئے سعی کی جاتی ہے۔دوسرا حصہ وہ ہے جس میں پیچھے آنے والوں کیلئے نشان چھوڑے جاتے ہیں۔ان دونوں کی جزا بندوں کو دی جائے گی۔

خالقِ کل کیلئے ہر شئے کا حساب کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔اعمال نامے میں کچھ مخفی نہیں رہے گا۔

(تفسیرِ فاضلی ،منزل پنجم،ص ۳۸۰)

۴۔ سورہ الاسراء کی آیات **اور ہر انسان کا نصیب ہم نے اس کے گلے میں لگا دیا۔اور اس کیلئے قیامت کے دن ایک کتاب نکالیں گے،جسے کھلا ہوا پائے گا۔پڑھ لے اپنی کتاب۔آج تو خود ہی اپنا حساب کرنے کیلئے کافی ہے۔ (الاسراء، ۱۷:۱۳۔۱۴)** کے ضمن میں تفسیرِ فاضلی کا نقطۂ نظر ہے کہ

شعور کی موجودگی میں شریعت کا ماننا لازم ہے۔جو شعور کے ساتھ بھلائی کی راہ اختیار کرے گا وہ بھی لکھا جائے گا، جو شعور کے ساتھ برائی کی راہ اختیار کرے گا وہ بھی لکھا جائے گا۔

یہ کتاب انسان کے رُخ اور عمل کو صحیح طور پر سنبھالتی جا رہی ہے۔قیامت کے دن اسے امرِ الٰہی سے نکالا جائے گا،تو صاحبِ عمل کو حیرت ہوگی کہ اس کا کوئی بھی عمل درج ہونے سے رہ نہیں گیا۔

جس نیت کے ساتھ کوئی عمل کیا جا رہا ہے وہ بھی اللہ کے سامنے ہے۔

ہر انسان کا نامۂ اعمال اس کے ساتھ ہے۔انسان جو رُخ اختیار کرتا ہے اسی کی جزا پائے گا۔

انسان کا نصیب اس کے عمل کے بعد لکھا جاتا ہے۔

نیت کو اللہ سے بڑھ کر کوئی نہیں جان سکتا،اس لئے شقاوت اور سعادت کا فیصلہ وہی کر سکتا ہے۔

عمل کے لئے مہلت اور توفیق سب کو ایک جیسی نہیں دی جاتی،اس لئے حسنِ عمل کو حسنِ نیت سے ہی دیکھا جا سکتا ہے۔

(تفسیرِ فاضلی ،منزل چہارم، فاضلی فاؤنڈیشن لاہور، بار دوم ۲۱۰۲،ص ۷)

۵۔ سورہ الانفطار (۸۲) کی آیات وَ اِنَّ عَلَیۡکُمۡ لَحٰفِظِیۡنَ۔ کِرَامًا کَاتِبِیۡنَ ۔ یَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ۔ ''بے شک تم پر حفاظت کرنے والے مامور ہیں۔معزز کاتبین۔وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔''(۸۲:۱۰۔۱۲) کے ضمن میں تفسیرِ فاضلی کا نقطۂ نظر ہے کہ

موت کے وقت تک توفیق عطا کر کے،اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کی حفاظت کا بھی بندوبست کیا گیا ہے۔

ہمارا کیا محفوظ کیا جا رہا ہے۔

فعل سرزد ہونے کے بعد لکھا جاتا ہے۔

ہمیں ہمارے کیے کی جزا ہی دی جائے گی۔

اعمال نامہ تیار کرنے والوں کی صفت بیان فرمائی گئی ہے، کہ وہ معزز ہیں، اللہ کے امر کی تعمیل میں قطعاً کوتاہی نہیں کرتے۔

(تفسیرِ فاضلی، منزل ہفتم، فاضلی فاؤنڈیشن لاہور، باراوّل ۱۹۹۸ء، ص ۳۸۶۔۳۸۷)

16. Abdul Hafeez Fazli, "Quranic View of Omniscience and Human Freedom", ibid.

17. بے شک اللہ آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ کہیں ٹل نہ جائیں۔ اگر وہ ٹل جائیں تو کوئی انھیں تھامنے والا نہیں۔ بے شک اللہ حلیم ہے غفور ہے۔ (سورہ فاطر، ۳۵:۴۱)